ویٰقوم مالیٓ ادعوکم الی النجوۃ و تدعوننیٓ الی النارہ

اے میری قوم! یہ کیا بات ہے کہ میں تمہیں نجات کی طرف دعوت دے رہا ہوں اور تم مجھے آگ کی طرف بلا رہے ہو؟

(سورہ مومن آیت نمبر ۴۱) (ترجمہ از توضیح القرآن)

ماہنامہ

راہِ نجات

بارھمولہ کشمیر

وقت کے پھسلن بھرے موڑوں میں اب ہم پھنس گئے!
حیف چھوٹی ہم سے کیوں اصحابِ ؓ کی راہِ نجات!
(شاعرِ توحید) مرغوب

مدیر
منیر احمد وانی

مئی، جون، جولائی ۲۰۱۴ء

Rs. : 75/-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ویٰقَوۡمِ مَالِیۡۤ اَدۡعُوۡکُمۡ اِلَی النَّجٰوۃِ وَ تَدۡعُوۡنَنِیۡۤ اِلَی النَّارِ ط

(ترجمہ از توضیح القرآن)

اے میری قوم! یہ کیا بات ہے کہ میں تمہیں نجات کی طرف دعوت دے رہا، اور تم مجھے آگ کی طرف بلا رہے ہو؟ (سورہ مومن آیت نمبر ۴۱)

وقت کے پھسلن بھرے موڑ صوں میں اب ہم پھنس گئے! : حیف چھوٹی ہم سے کیوں اصحابؓ کی راہِ نجات!
(شاعر توحید مرغوب بانہالی)

ماہنامہ

آئینہ کشمیر

راہِ نجات

بارہمولہ کشمیر

جلد نمبر ۳ شمارہ نمبر ۵، ۶، ۷ بابت ماہِ مئی، جون جولائی ۲۰۱۴ء

سرپرست

آسی غلام نبی وانی

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر، اونر

منیر احمد وانی

﴿زرِتعاون﴾

(فی شمارہ =/25روپے)(سالانہ =/300روپے)

(خصوصی تعاون قارئین کی صوابدید پر ہے)

﴿خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ﴾

دفتر ماہنامہ راہِ نجات لون کمپلیکس متصل شیروانی میموریل ہال بارہمولہ کشمیر

PIN :- 193101 (J&K)

اگر اس دائرہ ⬭ میں سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کی خریداری کی مدت ختم ہوگئی ہے لہٰذا اپنی خریداری کو جاری رکھنے کے لئے آئندہ کا زرِتعاون ارسال فرمائیں۔

بانی و سرپرست: عاصیؔ غلام نبی وانی 9797087730

نائب سرپرست: سالکؔ بلال 9596002936

ایڈیٹر، اونر، پبلشر: منیر احمد وانی 9906518328

(نوٹ) راہِ نجات ایک خالص تحقیقی رسالہ ہے۔ مُتدیّن اہل علم و قلم حضرات کے تحقیقی مقالوں اور رشحاتِ قلم کو امت مسلمہ کے سامنے پیش کرنا ہمارا بنیادی مقصد ہے۔ قدیم اور جدید کے صالح امتزاج کو مدنظر رکھتے ہوئے امت مسلمہ کو اس پرآشوب دور میں صحیح حقائق سے باخبر رکھنا ہم وقت کی اہم اور اشد ضرورت سمجھتے ہیں۔

لیکن!

اس کے لئے جدید متدین دانشور طبقہ اور علوم اسلامیہ کے حاملین و وارثین علوم نبوت کو شانہ بہ شانہ ہو کر کام کرنا ہوگا۔ ادارہ راہِ نجات اس کارِ عظیم کے لئے ایک پلیٹ فارم کی حیثیت سے کام کرنے کا عزم لئے ہوئے صحافتی دنیا میں کود پڑا ہے۔ خدا کرے ادارہ کا یہ دیرینہ خواب پورا ہو جائے۔

نوٹ

مدیر کا مقالہ نگار کی ہر بات سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے

اس شمارے میں

صفحہ	مضامین نگار	مضامین	نام گوشہ	نمبر شمار
۴	مدیر	اداریہ	ادارت	۱
5	آسی غلام نبی وانی (سرپرست رسالہ خذا)	آئینہ کشمیر	تحقیق	۲
۶۹ 81	ملک جاوید احمد مولانا نورالرحمان الندوی	(۱) حضرت نبی کریمؐ اور امی عائشہؓ کے نکاح کی صحیح نوعیت (۲) اقبالؔ محسن انسانیت کے حضور میں ہی کیوں	تذکرۃ الصالحین	۳
۱۰۰ ۱۰۶ ۱۰۷	خالق پرویزؔ آسیؔ فتحکڈھی آسیؔ فتحکڈھی	(۱) شہرآشوب (۲) آہِ سحرگاہی (۳) یَالَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْن	ادب اسلامی	۴
۱۰۹	آسی غلام نبی وانی (سرپرست رسالہ خذا)	مکار یہودی وزیر نے کس طرح دین عیسیٰ میں تفرقہ ڈالا	درس مثنوی	۵
۱۱۲	آسی غلام نبی وانی (سرپرست رسالہ خذا)	شرعی وفقہی اصطلاحات کی وضاحت سوال وجواب کی روشنی میں	سوال وجواب	۶
۱۱۵	آسی غلام نبی وانی (سرپرست رسالہ خذا)	"نظریہ اجتہاد اور اقبالؔ" نام کی کتاب پر تبصرہ	تبصرے وتجزیے	۷
۱۱۸	منظور احمد ڈار	مکتوب بنام راونجات	مکتوبات بنام راونجات	۸
۱۲۰	آسی غلام نبی وانی (سرپرست رسالہ خذا)	اب سے آسیؔ (ذاتی تخلص میں تبدیلی اور اس کی وجہ)	-----	۹

(نوٹ) ادارہ کا مقالہ نگار کی رائے کے ساتھ متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

اِداریہ

آج کا خصوصی شمارہ ہم بہت ہی تاخیر کے ساتھ شائع کر رہے ہیں وجہ صرف یہ ہے کہ یہ شمارہ تاریخ کشمیر کیساتھ تعلق رکھتا ہے اور اس کو چھوٹی چھوٹی قسطوں میں شائع کرنے سے زیادہ بہتر ادارہ نے یہی سمجھا کہ اس کو ایک ہی نمبر میں تسلسل کے ساتھ شائع کیا جائے۔

ہماری بدقسمتی یہ رہی ہے کہ ہم اپنی تاریخ کے ساتھ بڑی لاپرواہی برت رہے ہیں، حالانکہ کوئی قوم اپنی تاریخ کا مطالعہ کئے بغیر اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی بھی صحیح راہِ عمل اختیار کرنے میں ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتی ہے۔

تاریخ میں دو طرح کے لوگ بڑی اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ایک وہ لوگ جنہوں نے اپنی زندگی کا محبوب مشغلہ سیاست وحکومت کو بنایا اور دوسرے وہ لوگ جنہوں نے مذہب اور علم وادب کی خدمت انجام دی ہے۔ان دونوں طبقوں کے حالات کا جاننا ایک طالب علم کے لیے نہایت ہی ضروری ہے۔علامہ اقبالؒ کا شعر ہے۔

یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے

میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے

اسی ضرورت کے پیش نظر آج کا یہ خصوصی نمبر ہدیہ قارئین کیا جاتا ہے۔ہم یہ دعویٰ نہیں کرسکتے ہیں کہ اس موضوع پر یہ نمبر حرف آخر ہے تاہم یہ ہماری ایک مخلصانہ کوشش ہے تاکہ اس موضوع کے ساتھ مناسبت رکھنے والے اہل علم اور اہل قلم کے لیے ایک راستہ کھلے اور وہ اس میں مزید رنگ بھرنے کے لیے اپنی کوششوں میں اضافہ کریں۔امید ہے کہ اس کاوش کو اسی تناظر میں لیا جائے گا ذاتی اعتبار سے ہمارا ادارہ ایک غیر سیاسی ادارہ ہے۔

مدیر

آئینہ کشمیر

آسی غلام نبی وانی (سرپرست ادارہ راہِ نجات)

کشمیر میں اسلام کا ظہور کس طرح ہوا:

جب کائنات کا خالق و مالک کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے لیے اُسی قسم کے اسباب پیدا کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا ہے۔ وہ عالم غیب سے ایسے اسباب پیدا فرماتا ہے جو انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتے ہیں۔ ظہور و عروج اسلام کے لیے اس نے ملک کشمیر میں بھی اسی قسم کا معاملہ فرمایا۔ کہ ایک شخص جس کا نام ریچن تھا جو تبت کا رہنے والا تھا اور بدھ مذہب کا پیرو تھا آوارگی کے انداز میں کشمیر پہنچا۔ یہاں اس نے لوگوں کو شیومت کا برائے نام پیروکار پایا۔ حال یہ تھا کہ لوگ خدا سے بھی منحرف ہو چکے تھے اس وقت یہاں راجہ سہدیو حکومت کرتا تھا، جس کا سپہ سالار رام چندر تھا۔ ریچن نے رام چندر کے زیر سایہ پناہ لی، جس نے خوشی سے اس تبّتی آوارہ کو پناہ دی۔

اسی دور میں سواد کنیر (موجودہ پاکستان کا ایک علاقہ) سے نکل کر شاہ میر نام کا ایک مسلمان وارد کشمیر ہوا تھا۔ اس شخص کے متعلق اس کے داد سائیں قور شاہ نے پیشین گوئی کی تھی کہ یہ لڑکا کشمیر کا بادشاہ بنے گا، جب اس کے کانوں میں اپنے دادا صاحب کی یہ پیشین گوئی ڈالی گئی تو اس نے کشمیر آنے کا ارادہ کیا، یہاں کس کو معلوم تھا کہ یہی آوارہ روزگار ایک دن کشمیر کا بادشاہ بنے گا۔ اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے یہ شخص اپنے اہل و عیال کے ہمراہ ۱۳۴۰ء کو گھر سے نکلا۔ پہاڑوں کے راستوں کو عبور کرتے ہوئے بارہمولہ پہنچا۔ یہاں اس زمانے میں راجہ سہدیو حکومت کرتا تھا۔ راجہ سہدیو نے اس کی شرافت کو دیکھ کر ایک موضع جاگیر میں دیا۔ راجہ سہدیو نے ایک اور شخص رام چندر کو اپنی حکومت میں منصب سپہ سالاری بخشا اور خود بادشاہی کے معاملات چلاتا رہا۔ چونکہ اس زمانے میں مذہبی تعصب نہ پایا جاتا تھا، لہٰذا شاہ میر اور راجہ سہدیو میں مذہبی دوری کے باوجود دوستی رہی۔

رینچن کو شاہ میر نے متاثر کیا:

شاہ میر چونکہ مسلمان تھا اور قدرت نے اس کو اس ملک میں پہنچا کر رینچن سے بھی قریب کر دیا تھا۔ اس قربت کی وجہ سے رینچن نے جب قریب سے شاہ میر کو دیکھا تو اس کے زُہد کو تقویٰ کو دیکھ کر اس کے دل میں اسلام کی نسبت نیک ظن پیدا ہو گیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کے اندر اللہ نے ایک قسم کی میقناطیسی کشش رکھی ہے، جس کی وجہ سے سلیم الفطرت لوگ خود بہ خود اسلام کی طرف راغب ہوتے ہیں۔

ذوالقدر خان (ذلجو) کا حملہ:

راجہ سہدیو خود نیک سیرت، فیاض اور عادل تھا، لیکن اس کی رعایا صدیوں سے نیک و بد کی تمیز سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی اور یہ مادہ پکتے پکتے راجہ سہدیو کے زمانے میں کمال کو پہنچ گیا تھا۔ جب بد تمیزی اور ظلم وستم کی کوئی حد نہ رہی تو اللہ نے ان نانہجاروں سے انتقام لینے کے لیے اپنی ناراضگی کا اظہار اس طرح کیا کہ ۱۳۲۳ھ میں تارتاری قوم کا ایک سپہ سالار ذوالقدر خان ستر ہزار جنگی سوار لے کر کابل و پنجاب کے راستے سے بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہوا اور کشمیر میں داخل ہو گیا۔ جہاں تک اس سپہ سالار کے مذہب کا تعلق ہے وہ مسلمان نہیں تھا۔ کیونکہ اس زمانے تک صرف چند چغتائی سردار مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ ان میں اکثر اپنے آباء واجداد کے مشرکانہ عقائد کے پیرو تھے۔ یہ شخص منگولیا سے تعلق رکھتا تھا اور ہلاکو خان کی ہدایت پر کشمیر پر حملہ کرتا تھا۔ راجہ سہدیو سخت گھبرایا مقابلہ کی طاقت نہ پا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ بہت سے لوگوں نے بھی بادشاہ کے شانہ بہ شانہ ملک کو چھوڑا۔ سہدیو نے کشتواڑ پہنچ کر دم لیا۔ جو لوگ ملک میں پیچھے رہ گئے تھے ذوالقدر خان نے ان کا قتل عام کیا۔ کئی لوگوں کو قید کیا۔ کئی لوگوں کو بیچ ڈالا۔ مظلوم عوام کا مال واسباب ضبط کیا۔ بستیوں کو آگ لگایا آٹھ ماہ تک یہ سلسلہ جاری رکھا۔ سردی شروع ہونے کی وجہ سے واپسی کا ارادہ کیا تو لوگوں سے پوچھا کہ کونسا راستہ نزدیک ہے۔ لوگوں نے دیورسر کا راستہ بتایا جو نزدیک تو تھا لیکن سخت خطرناک تھا۔ لوگوں نے غالباً اس کی شرارت اور ظلم وستم کا بدلہ چکانے کے لیے اس کو اس خطرناک راستے پر ڈالنا چاہا، لیکن ابھی چونکہ خدا ان کی سابقہ نافرمانیوں کی مزید سزا دینا چاہتا تھا واپسی پر اس نے ان کو بھی اپنے ہمراہ لیا اور

جب یہ پورا قافلہ دیوہ سر پہاڑ پر پہنچا تو شدید برف، بارش اور ژالہ باری نے سبھوں کو دبوچ لیا اور یہ پورا قافلہ برف کے نیچے دب گیا خبر پہنچانے کے لیے بھی کوئی فرد نہ بچ سکا۔ اسی ذوالقدر خان بادشاہ کو کشمیری ذوالجو بھی کہتے ہیں۔ ادھر رام چندر، رینچن اور شاہ میر بدستور اپنے قلعوں میں بے بس پناہ گزینوں کی طرح رہے۔ بچے کھچے لوگ کس مپرسی کی حالت میں پڑے تھے۔ ابھی لوگ اپنے رشتہ داروں کو اس تباہی کے بعد ڈھونڈ ہی رہے تھے کہ آس پاس کے پہاڑی خان کوئی حکومت نہ پا کر وادی کے علاقوں میں داخل ہو کر لوٹ مار کرنے لگے۔ ان کے ظلم سے نجات پانے کے لیے لوگ رام چندر سے دادخواہ ہوئے رام چندر نے رینچن شاہ اور شاہ میر کو کچھ فوج دے کر یہ لوٹ مار کرنے والوں کے خلاف کاروائی کے لیے متعین کیا۔ رینچن نے پہاڑی خانوں کو گرفتار کر کے عبرت ناک سزا دے کر عوام کو ان لٹیروں سے نجات دلائی۔ لوگوں نے خواہش ہو کر نذرانے پیش کئے، لیکن ساتھ ہی رینچن کے دل میں حکومت کی ہوس پیدا ہوگئی۔ اس وقت تک رینچن نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے رام چندر کی حکومت ختم کرنے کا ارادہ کیا جو اُن دِنوں اندرکوٹ میں مقیم تھا۔ اور پھر ایک خاص سازش کے تحت اپنے ہمدردوں کے ساتھ رات کے وقت رام چندر کی خواب گاہ میں داخل ہو کر اس کے حفاظتی عملہ کے سمیت سبھوں کو قتل کیا اور خود شاہی محفل میں تخت شاہی پر قابض ہوا۔ اصل راجہ کشتواڑ میں تھا۔ اس نے دوبارہ سلطنت حاصل کرنے کر لیے بہت کوشش کی لیکن کچھ ہاتھ نہ آیا اس واقعہ سے ہندو راجوں کے ہاتھ سے ملک نکل کر ایک بڑا انقلاب آیا۔ بادشاہ بننے کے بعد رینچن نے اپنے آقا رام چندر کی بیٹی کوٹہ رانی سے شادی کی۔ رام چندر کے بیٹے راون چندر کو رینہ خطاب سے نوازا۔ اُسکے باپ کی جاگیر اس کے حوالہ کر دی۔ تبت کا کچھ علاقہ جو کشمیر کی ماتحتی میں تھا اس کو بخش دیا۔ شاہ میر کو اپنا خاص معاون بنایا۔ اپنے بیٹے حیدر خان کا استاد بھی شاہ میر کو مقرر کیا۔ مذہبی اعتبار سے یہاں بڑی افراتفری تھی۔ ایسے پریشان کن کے حالات میں رینچن کو مذہب کی تلاش ہوئی ایک دن ارادہ کیا کل صبح جس شخص کو میں سب سے پہلے دیکھوں گا اُسی کا دین اختیار کروں گا۔ آنے والی صبح کو اُس کی نذر ایک فقیر پر بڑی جس کا نام بلبل شاہ تھا جو ان ہی ایام میں ۷۲۵ھ میں سرینگر میں وارد ہوا تھا۔ بلبل شاہ کا اصلی نام سید شرف الدین تھا اور بلبل شاہؒ ایک کرامت کے ظاہر ہونے کی وجہ سے

اس کا لقب پڑ گیا تھا۔ اس طرح بلبل شاہ کے ہاتھ پر رینچن اور دیگر اُمراء اور عوام نے اسلام قبول کیا۔ سید صاحب نے رینچن کا نام بدل کر اس کا اسلامی نام صدرالدین رکھا۔ اسلام قبول کر کے اس نے اسلامی انداز سے دینی امور انجام دئے اور دو سال سات ماہ زندہ رہنے کے بعد فوت ہوا۔ حیدر خان نام کا ایک چودہ سالہ بیٹا اپنے پیچھے چھوڑا۔ بیوہ کوٹا رانی نے سہدیو کے بھائی اودیان دیو کو بلا کر تخت پر بٹھایا۔ وہ بھی ذولچو کے حملے کے وقت سواد کشمیر کی طرف بھاگا تھا۔ کوٹا رانی نے اودیان دیو کے ساتھ شادی بھی کی۔ شاہ میر کو منصب وزارت پر مامور کیا۔ چار سال کے بعد ایک ترک سپہ سالار نے ایک بڑے لشکر کے ساتھ کشمیر پر حملہ کیا۔ اودیان دیو گھبرایا۔ لیکن کوٹا رانی نے ہمت نہ ہاری۔ لوگوں کو مقابلہ کئے لیے اُبھارا۔ شاہ میر کو مقابلہ آرائی کے لیے ذمہ دار بنا دیا۔ شاہ میر نے لوگوں کے دلوں میں ایک نیا جذبہ و جوش پیدا کیا۔ ترکوں کو شکست کھانی پڑی۔ کوٹا رانی نے اودیان دیو کو تلاش کرایا اور تبت سے واپس بُلایا۔ پھر تخت پر بٹھایا اور حکمرانی کرنے لگے۔ امن و امان کی حالت میں پندرہ سال حکومت کر کے ۱۳۴۱ء کو اودیان دیو مر گیا۔ شوہر کی وفات کے بعد کوٹا رانی نے خود حکومت سنبھالی، لیکن ملک میں بدامنی پھیل گئی۔ دوسری طرف سے شاہ میر اپنے دادا صاحب کی بشارت کا منتظر تھا۔ وہ سرینگر آیا۔ خاص افراد کے ساتھ رابطہ قائم کیا۔ سبھوں نے اسکی اطاعت کا اقرار کیا اور اس کو مسند حکومت پر بٹھلایا۔ کوٹا رانی نے صرف ۵۰ دن تک حکومت کی۔ یہاں سے مستقل طور سے مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی جو پھر تقریباً تک ۵۰۰ سال تک چلتی رہی جس کی تفصیل اس طرح ہے۔

نمبر شمار	نام ادوار	کہاں سے کہاں تک
۱	غیر مستحکم دور	سنہ ۷۲۵ھ سے سنہ ۷۴۳ء تک (۱۷ سال ۱۰ ماہ ۲ دن بمطابق شمسی سال)
۲	شاہ میری دور	سنہ ۷۴۳ھ سے سنہ ۹۶۲ھ تک (۲۱۱ سال بمطابق شمسی سال)
۳	چک دور	سنہ ۹۶۲ھ سے سنہ ۹۹۴ھ تک (۳۲ سال ۱ ماہ ۱ دن بمطابق شمسی سال)
۴	مغل دور	سنہ ۹۹۴ھ سے سنہ ۱۱۶۶ھ تک (۱۷۲ سال بمطابق شمسی سال)
۵	افغان دور	سنہ ۱۱۶۶ھ سے سنہ ۱۲۳۴ھ تک (۶۶ سال بمطابق شمسی سال)

غیر مستحکم دور کی تشریح:

اسلام قبول کرنے سے پہلے ہی رینچن نے سہدیو کی حکومت مٹائی تھی لیکن اس سے زیادہ عرصہ تک حکمرانی کا موقعہ نہ ملا۔ اس کا بیٹا حیدر خان نابالغ ہونے کی وجہ سے ملک نہ سنبھال سکا۔ اس لیے رینچن کی بیوی کوٹا رانی نے سہدیو کے بھائی اودیان دیو سے نکاح کر کے حکومت اس کے سپرد کر دی۔ اگر چہ اودیان دیو کے عقائد کو مسلمانوں کے عقائد کے ساتھ وابستہ نہیں کیا جاسکتا ہے لیکن شاہ میر چونکہ مسلمان تھا اور پہلے ہی سے منصب وزارت پر فائز تھا۔ حکومت کے کچھ سر برآوردہ حضرات بھی حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے۔ عوامی حلقوں میں بھی اسلام پسند لوگ موجود تھے جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ اس دور کو اگر مکمل اسلامی دور بھی نہیں کہا جائے گا لیکن اہم منصبوں پر فائز ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے اثر ورسوخ کو خارج بھی نہیں کیا جاسکتا البتہ بقول محمد دین فوقؔ اس دور کو (زمانہ بے استقلالی) سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔

خریداران راہِ نجات سے ایک گذارش

ہم نے اپنے خریداروں سے گذارش کی تھی کہ جو حضرات کسی وجہ سے دفتر راہِ نجات میں حاضر ہو کر ممبر شپ کی رقم جمع نہیں کر سکتے ہیں وہ ٹی۔ پی بارہمولہ کے اکاونٹ نمبر:

0213010100004334

میں جمع کر کے ہمیں فون کے ذریعے اطلاع دیں لیکن ہم نے اس اکاونٹ نمبر کو بند کروایا ہے۔ دوسرے نئے نمبر کی اطلاع کسی دوسرے شمارے میں دی جائے گی۔

دورِ رینچن شاہ

۷۲۵ھ سے ۷۲۷ھ تک

جب رینچن نے اپنے آبائی وطن سے اپنی جان بچانے کے لئے وادی کشمیر کا رُخ کیا تو وہ یہاں زوجیلا کے درہ سے داخل ہوا۔ قدیم ترین زمانوں سے یہی راستہ کشمیر کو، لداخ، تبت، چین اور مرکزی ایشاء سے ملاتا رہا ہے۔ یہاں پہنچنے کے بعد رینچن نے اسی گگن گیر میں سکونت اختیار کی، جو وادی سونہ مرگ کو عبور کرنے کے بعد درہ لار کا پہلا گاؤں ہے۔ راجہ سہدیو کے وزیر اعظم رام چندر اور سپہ سالار اعظم کا محل اسی گاؤں میں واقع تھا۔ رام چندر نے رینچن کا بڑی شفقت سے استقبال کیا اور اسے پناہ بھی دی اور ملازمت بھی۔ یہیں رینچن کی ملاقات شاہ میر سے ہوئی جو شاید اس سے پہلے یہاں پہنچ چکا تھا۔ قدرت نے ان ہی کے مقدر میں یہاں کی بادشاہت لکھدی تھی اور مغلوں کے ایک خونخوار شہزادے اور اسکی فوجون نے ذرا پہلے جو تباہی یہاں پھیلائی تھی یہ اس کے عینی شاہد تھے۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے اس وقت کے راجہ نے جو غیر ذمہ دارانہ اور بزدلانہ طریقہ کار اپنایا تھا وہ بھی دیکھ لیا تھا، کیوں کہ ذولقدر خان (ذلجو) کی آمد کے وقت اُن کو دیکھتے ہی راجہ اور اس کے وزیر جان بچانے کے لئے بھاگ گئے تھے اور سپاہ سالار اعظم نے محل میں پناہ لی تھی اور عوام نے بزدلی، کمزوری اور خوف کا مظاہرہ کیا تھا۔ ان حالات نے رینچن جیسے زیرک شخص کو راجہ بننے کا ایک عمدہ خیال فراہم کیا۔ راجہ سہدیو چونکہ یہاں سے بھاگ گیا تھا اور بظاہر اس کا جانشین رام چندر ہی بننے والا تھا، اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے میں رینچن کو رام چندر ہی ایک حریف نظر آتا تھا۔ رینچن نے یہ چال کی کہ بظاہر وہ بڑی وفاداری کے ساتھ رام چندر کے ساتھ پیش آتا تھا اور ساتھ ساتھ اپنے آپ کو عوام میں مقبول بنانے کے لئے اور ذوالجو کے حملے کے بعد لوگوں کو دوبارہ بسانے کے لیے کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ اس سے اس کو دو کامیابیاں حاصل ہوئیں ایک طرف سے وہ وزیر اعظم کا اعتماد حاصل کر سکا اور دوسری طرف سے عوام کی ہمدردی۔ رینچن نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنے بااعتماد بھٹہ سپاہیوں کو محل کے اندر جمع کر لیا اور جب مغل اپنی لوٹ مار کے بعد یہاں سے واپس چلے گئے تو ایک دن اچانک رام چندر کو قتل کیا اور پھر ۱۶ اکتوبر ۱۳۲۰ء کو بادشاہِ کشمیر ہونے کا اعلان کر دیا۔

اس وقت ہندو لوگ اس قدر پست ہمت ہو چکے تھے کہ وہ ہر اس آدمی کو قبول کرنے کے لئے تیار تھے جو تخت شاہی پر قابض ہو جاتا۔ رینچن جو بڑا ہوشیار تھا خوب جانتا تھا کہ راجہ کی حیثیت سے اسے کیا کرنا چاہیے۔ ایک طرف سے اسے امن وامان بحال کرنا تھا اور دوسری طرف سے مغلوں سے زخم کھائی ہوئی قوم کی مرہم پڑی کرنی تھی، لیکن یہ کام کرنے کے لئے اس نے دوطرفہ حکمت عملی سے کام لیا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ رام چندر کی اولاد کسی بھی وقت اس کی زبردست حریف بن سکتی ہے۔ لہٰذا اُس نے اس کی بیٹی کوٹہ رانی سے شادی کر لی اور بیٹے راون چندر کو اس کے باپ کے عہدہ پر فائز کر دیا۔ ساتھ ہی اپنے دوست شاہ میر کو وزارت کا منصب پیش کیا ایک اور خطرہ یہ بھی تھا کہ یہاں ایک ''لون'' قبیلہ تھا جو قدیم زمانہ سے ایک زراعت پیشہ قبیلہ تھا۔ اور جنگ وجدل میں خوشی محسوس کرتا تھا۔ رینچن نے ان کا زور توڑا اور انہیں پراگندہ کر دیا۔ ان تینوں خطرات سے نمٹنے کے بعد اس سرزمین کو امن وسکون بخشا۔ لوگ پہلے کی طرح تہوار منانے لگے، کیوں کہ یہ بادشاہ لوگوں کی فلاح و بہود میں بے حد دلچسپی لیتا تھا اور عدل وانصاف کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے والے کسی آدمی کو خواہ وہ اس کا بیٹا یا وزیر ہی کیوں نہ ہوتا سزا دیے بغیر نہیں چھوڑتا تھا۔ رینچن نے چونکہ دھوکے سے حکومت حاصل کی تھی لہٰذا اپنا یہ بدنما داغ مٹانے کے لیے اندر سے بے چین تھا۔ وہ اپنی رعیت کے ساتھ ہم آہنگ بننا چاہتا تھا تا کہ ان ہی کی طرح رسم و رواج، مذہب اور روایات اختیار کر کے اس قوم کا ایک فرد بنے، اس نے پہلے شیو پرستی کے مسلک کو اپنانے کی خواہش ظاہر کی وہ بھی اس لیے کہ یہ ہندو مذہب کی ایک مقبول ترین شکل تھی لہٰذا مذہبی اعتبار سے بھی اپنے آپکو طاقتور بنانا چاہا۔ وہ دیوسوامی کے پاس گیا جو شیو پرستوں کا بڑا گرو (استاد) تھا اور اس سے التجا کی کہ وہ اپنے پجاریوں میں اسکو بھی داخل کرے۔ دیوسوامی بڑا سرکش اور مغرور آدمی تھا۔ اس نے حقارت سے رینچن کی التجا کو ٹھکرا دیا۔ رینچن اگر چہ ایک بڑا سیاست دان اور اپنے آپ کو خطرات میں ڈالنے والا آدمی تھا۔ چونکہ بدھ مت کا پیرو تھا اس لیے برہمن کا رُتبہ حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ اگر چہ بدھ مت اور برہمن ازم کے درمیان بہت کم فرق ہے، پھر بھی رینچن کو ٹھکرا دیا گیا لہٰذا روایت پرست برہمن پُجاری دیوسوامی نے رینچن کو ناپاک سمجھ کر قبول نہ کیا۔ اس طرح کشمیر کے ہندوؤں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا سنہری موقعہ

ہاتھ سے کھودیا مگر شاہ میر نے اس موقعہ کا فائدہ اُٹھایا اور رنچن کو پریشان پاکر اُسے تسلی دی کہ وہ صبر سے کام لے تاکہ اس معاملے میں آگے چل کر اس کے لیے کوئی راستہ کھل جائے۔ چنانچہ رنچن نے فیصلہ لیا کہ آنے والی صبح کو سب سے پہلے جس آدمی کو دیکھے گا اسی کا مذہب قبول کرے گا۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ رنچن کی نظر ایک مسلمان فقیر بلبل شاہ پر پڑی لہٰذا وہ مسلمان ہوگیا اور اس نے سلطان صدرالدین کا نام اختیار کیا۔

دورِ رنچن پر تبصرہ

رنچن کشمیر کا پہلا مسلمان بادشاہ ہے، وہ اسلام قبول کرنے بعد زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہا۔ لیکن اس مختصر مدت میں وہ ایک اچھا مسلمان بن کر رہا۔ اور جس طرح ایک اچھا مسلمان حکمران رعایا کے ساتھ سلوک کرتا ہے اس نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا۔ اپنے نام پر سرینگر میں ایک محلہ رنچن پورہ تعمیر کرایا۔ وہیں ایک مسجد بنوائی جو کشمیر میں پہلی مسجد تھی۔ یہاں سے نزدیک ہی عالی کدل سرینگر میں اس نے ایک اور مسجد تعمیر کروائی اور ایک لنگر خانہ قائم کیا جو بعد میں سلطان کے مذہبی پیشوا بلبل شاہ کی یاد میں بلبل لنگر کے نام سے مشہور ہوا۔

مسلمان ہونے سے قبل رام چندر کو قتل کرکے اور خود بادشاہ بن کر جو کارنامہ رنچن نے انجام دیا تھا وہ اگر چہ ایک انقلابی قدم تھا لیکن اس نے رنچن کے لیے دوستوں سے زیادہ دشمن پیدا کیے۔ چنانچہ ہندو لوگ سابقہ بادشاہ راجہ سہدیو کے چچازاد بھائی اودیان دیو کی قیادت میں رنچن کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور اس پر حملہ کرکے زخمی کردیا۔ آخر کار ۱۳۲۳ء کو بادشاہ فوت ہوا اور اپنے مرشد بلبل شاہؒ کے مزار کے پہلو میں بلبل لنگر میں ہی دفن کیا گیا۔ اس کی وفات کے بعد اقتدار حاصل کرنے کے لیے تین جماعتیں سامنے آگئیں۔

(۱) کسان جماعت جن کی راہنمائی جاگیردار کررہے تھے۔

(۲) شاہ پرست (ہندو بادشاہت کے خواہشمند) اُن کی رہبری اودیان دیو کر رہا تھا۔

(۳) ملکہ یعنی کوٹہ رانی کی جماعتیں جن کی پشت پناہی لون کررہے تھے، لیکن سیاست میں پختہ کار نہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ نابالغ شہزادہ حیدر تخت نشین کیا جائے۔ رانی خود حکومت چلانے کی خواہش مند نہ تھی۔

شاہ میر جو ایک چالاک سیاست دان کی طرح یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا اس نے سیاست کے

میدان میں ابھی کودنا اور تخت حاصل کرنا قبل از وقت اقدام سمجھا۔ چونکہ بادشاہ کو زخمی کرنے کا سبب اودیان دیو ہی بنا تھا اور اسی کو اس وقت اکثریت حاصل تھی لہٰذا اودیان دیو کو برسر اقتدار لانے میں اس نے اودیان دیو کو حیدر اور کوٹہ رانی پر ترجیح دے کر تخت سپرد کر دیا۔ جب اودیان دیو تخت پر بیٹھا کوٹہ رانی نے اس کے ساتھ شادی کی اس طرح دوبارہ ہندو اقتدار بحال ہوا۔ ایسا کردار ادا کرنے کی وجہ سے شاہ میر ہر دل عزیز بن گیا اور مستقبل میں اس کی کامیابی کا باعث بھی یہی بات بن گئی، کیوں کہ راجہ اودیان دیو ایک شدت پسند، کم عقل اور قدامت پسند آدمی تھا زیادہ وقت پوجا پاٹ میں گذارتا، جوگیا نہ لباس پہنتا۔ حکومت کا کاروبار کوٹہ رانی کے سپرد کرتا تھا۔ کوٹا رانی شاہ میر کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے خوفزدہ تھی۔ اسکی طاقت کو کمزور کرنے کے لیے شاہ میر کے دو بیٹوں جمشید و علی شیر کو علاقہ کامراج کے شمالی ضلع کا انتظام سنبھالنے پر روانہ کیا اور بھٹ بھکشن کو جو ایک بڑا عقل مند اور سیاست دان برہمن تھا مشیر اور فوج کا سپہ سالار بنایا اور اپنے دوسرے بیٹے جو اودیان دیو کے ساتھ شادی کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا سر پرست بھی مقرر کر دیا۔ ان ہی ایام میں جبکہ ایک طرف کوٹا رانی ہندو اقتدار کو از سر نو غلبہ دلانے کے لیے جدو جہد کر رہی تھی کشمیر پر خونخوار ترکوں نے دوراون کی سرکردگی میں دوبارہ حملہ کیا۔ اودیان دیو ایک بزدل آدمی کی طرح لداخ کی طرف بھاگا، لیکن کوٹا رانی نے مغلوں کے سابقہ حملہ کی تباہی کو دیکھ کر ہمت سے کام لیا۔ اپنی رعایا کو جوش دلایا اور شاہ میر کے ساتھ تعاون کا ہاتھ بڑھایا، کیوں کہ ایسا کر کے ہی وہ دشمن کی شکست سے بچ سکتی تھی۔ دونوں نے مل کر ملک کو حملہ آوروں سے بچایا۔

دورِ اُودیان دیو

۷۲۷ھ سے ۷۴۳ھ تک

جب دشمن واپس چلا تو رانی نے اودیان دیو کو دوبارہ بلا کر تخت پر بٹھایا، لیکن اس کی بزدلی کی وجہ سے اور شاہ میر کی وفاداری سے شاہ میر ایک قومی ہیرو بن کر اُبھرا۔ اس کے ذہن میں جو منصوبہ تھا اس سے پردہ ہٹایا اور رینچن کے بیٹے حیدر کو ماں کی حکومت کے خلاف کھڑا کیا۔ ایسی صورت حال میں جب راجہ ادھیان دیو ۱۳۳۹ء میں مرا تو کوٹا رانی نے اودیان کے نابالغ بیٹے کو جو تخت کا وارث تھا بر طرف کر کے اپنی رہائش تبدیل کر کے اندرکوٹ کے محل میں رہنے لگی اور بھٹ بھکشن اور لون قبیلے کی حمایت سے خود مالک تخت و تاج ہونے کا اعلان کیا اور شاہ میر کو مقابلہ کرنے کی دعوت دی، کیوں کہ بھٹ بھکشن شاہ میر کا ایک طاقت ور حریف تھا۔ شاہ میر نے بھٹ بھکشن کو قتل کرایا۔ عوام میں خوف و ہراس پھیلا اور وہ کوٹہ رانی کے ساتھ مل گئے۔ وہ اگرچہ طاقتور تھی، لیکن موقع سے فائدہ اٹھانے میں اس کی عقل نے کام نہیں کیا اور وہ شاہ میر کو موقع پر گرفتار نہ کر سکی۔ اُس نے اہم موقع کھو دیا۔ شاہ میر کو اپنا رول ادا کرنے کا موقعہ فراہم ہوا۔ اس نے رانی کو اندرکوٹ میں محصور کر لیا وہ خوب لڑی لیکن شاہ میر نے اُسے زیر کر لیا۔ اور اس نے ہتھیار ڈالے۔ اپنے حامیوں کو قتل ہونے سے بچانے کے لیے شاہ میر کی شرائط قبول کر لیں۔ اسکی ملکہ بننے اور حکومت میں حصہ دار ہونے پر اتفاق کر لیا۔ ملکہ نے شادی تو کر لی لیکن جب پہلی رات کمرۂ عروسی میں قدم رکھا تو یہ الفاظ کہتے ہوئے اپنے پیٹ میں خنجر گھونپ لیا ''کہ یہ ہے میری رضامندی'' اور پھر اس کی روح پرواز کر گئی۔ یہ عورت کشمیر کی آخری ہندو حکمران عورت تھی۔ جس نے ایک عقلمند اور دنیادار عورت کی طرح اپنی زندگی کا آغاز کیا اس کے بعد اپنے والد کے قاتل کو اپنا شوہر بنانا قبول کیا اور اسلام بھی قبول کیا۔ اور مطمئن زندگی بسر کی، پھر اودیان دیو کی بیوی بننا قبول کیا اور اس کے برائے نام اقتدار کے دور میں طاقت کا اصل سرچشمہ خود ہی بن کر رہی۔ اس شوہر کی موت کے بعد اس کے اقتدار کی خواہش اُس وقت سامنے آئی جب اس نے حکمران ہونے کا اعلان کیا بعد میں جب شاہ میر نے اسکو زیر کر لیا تو اس کی بیوی بننا منظور کر لیا۔ سارے واقعہ کو مدنظر

رکھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ یہ عورت خودغرض، جاہ طلب اور نادان تھی۔ایک موقعہ پر وہ شاہ میر کو گرفتار بھی کرسکتی تھی لیکن اپنی ناقص عقل کی وجہ سے وہ ایسا نہ کرسکی اور شاہ میر اپنی ہوشیاری کی وجہ سے اُسے زیر کرنے میں کامیاب ہوا۔

شاہ میری دور پر تبصرہ [۷۴۳ھ سے ۹۶۲ھ تک]

شاہ میر نے ریاست کو عدل وانصاف کے اصولوں پر مستحکم کیا۔شورش پسند لوگوں کو نیست ونابود کیا اور جو بچ گئے انہوں نے خود کو ملک کے کسانوں میں اپنی اصلی لون گوت (ذات) کے ساتھ جذب کیا تاکہ اپنے آپ کو دوسرے لوگوں سے ممتاز رکھ سکیں۔ماگرے اور چک قبائل کی ایک فوج تیار کی۔بادشاہ چونکہ ایک مہذب مسلمان تھا لہٰذا اپنی قوت سے اسلام کی پرامن اشاعت میں مدد کی۔کچھ اور مساجد تعمیر کرائیں۔وہ بذات خود ایک نیک انسان تھا۔دریائے جہلم وسندھ کے سنگم پر شہاب الدین پور نام کا شہر بھی بسایا۔وہ کوئی مسلمان مبلغ نہ تھا، لیکن بلبل شاہ کے ساتھ اُسکا طویل میل جول رہا، جو ایک بلند پایہ مبلغ تھا۔بظاہر شاہ میر ایک مہاجر مسلمان تھا، جس نے یہاں ہجرت کی اور پھر یہاں ہی کا ہو کر رہا۔وہ بڑی تیزی کے ساتھ اس ملک میں حالات سمجھنے میں کامیاب ہوا اور پھر یہاں کے عوام کے ساتھ گھل مل گیا۔اپنے منصوبے کو عملانے میں اس نے جلدی سے کام نہیں لیا۔حالات کا باریک بینی اور ہوشیاری سے جائزہ لے کر مناسب وقت پر کوئی اقدام کرتا تھا۔رینچن کے اسلام قبول کرنے میں وہ اسکا مشیر ومعاون بنا۔اور پھر اس کی وفات کے بعد اسلام کی خیرخواہی کے جذبے کے تحت اس کے بیٹے حیدر کی سرپرستی فرمائی۔اس نے جو مقام یہاں کی سیاست میں بتدریج حاصل کیا تھا اس سے کام لے کر اودیان دیو کے دور اقتدار میں جاگیرداروں کی حمایت اور دوستی حاصل کی۔سیاسی راہنما بننے کے لیے اس نے مغل وترک حملوں کے دوران جوانمردی سے کام کیا اور حالات کا مقابلہ کیا۔عوام کی مشکلات ومصائب میں ان کا شریک رہا۔جون راج لکھتا ہے کہ وہ خدا پر ایمان رکھنے والا خاموش کارکن تھا۔وہ ہر مشکل وقت پر عوام کا نجات دہندہ بنا اور خوفزدہ رعایا کے مال وجان کی حفاظت کی اور اس طرح عوام کا نجات دہندہ بنا۔شمس الدین کے لقب سے حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور سکہ جاری کیا۔۱۳۴۲ء میں فوت ہوا۔

شاہ میر کی وفات کے بعد اس کے دو بیٹوں جمشید اور علاؤالدین کے درمیان سلطنت کے معاملے میں اختلاف ہوا جس کا سبب یہ بنا کہ غلطی کی وجہ سے شاہ میر نے اپنی زندگی میں جمشید کی جانشینی کا اعلان نہ کیا اور جب جمشید نے خود ہی اپنی سلطنت کا اعلان کیا تو اس کے خودغرض بھائی علاؤالدین نے بغاوت کی۔ بڑا خون خرابہ ہوا۔ جمشید کا بے وفا وزیر بھاگ کر علاؤالدین کے ساتھ مل گیا۔ جمشید مشکل سے ایک سال اور چند ماہ حکومت کا کاروبار چلانے کے بعد موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور جب علاؤالدین تخت پر بیٹھا تو کشمیر میں ایک شدید قحط پڑا۔ ہر جگہ کشمیر اور کشمیر سے باہر غلہ کی کمی تھی۔ بادشاہ چونکہ خود خوراک کی فراہمی کی نگرانی کرتا تھا لہٰذا قحط کے اثرات دوسری جگہوں کی نسبت یہاں کم محسوس کیے گئے۔ علاؤالدین نے حکومت کو رینچن پور کے نزدیک ایک مقام پر منتقل کیا اور اس کا نام علاؤالدین پور رکھا۔ سماج میں اصلاح لانے کے لیے علاؤالدین نے یہ کام کیا کہ بدکردار عورت اپنے شوہر کی جائیداد کی وارث نہیں ہوسکتی ہے۔ ہندو سماج میں یہ خرابی پیدا ہوگئی تھی کہ باپ اپنی بیٹی کے ساتھ بدچلنی کا مرتکب ہوتا تھا۔ یہ مصیبت بڑھتی گئی اور رینچن [illegible] شاہ میر بھی اس کو نہ روک سکے۔ علاؤالدین چونکہ ایک طاقت ور اور بیباک اور مختلف قسم کا آدمی تھا اس نے ایسا حکم نافذ کیا اور تقریباً بارہ سال حکومت کر کے فوت ہوا۔

علاؤالدین کے بعد اسکا بیٹا شہاب الدین تخت نشین ہوا۔ اس نے کشمیر کی سلطنت کو پائیدار بنیادوں پر استوار کیا۔ اسے پُرامن ملک، وفادار بھائی اور قابل اعتبار وزیر نصیب ہوا۔ ذاتی طور بھی وہ ایک نیک اور بہادر انسان تھا۔ اس نے سلطنت کی توسیع کی خاطر ہمیشہ ریاستوں پر چڑھائی کی ۔ ہمسایہ ریاستوں میں اس کے دبدبے کی وجہ سے خوف محسوس کیا جانے لگا۔ ملی تعمیر نو کے لیے اُس نے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی ۔ سیلاب کے خطروں سے نمٹنے کے لیے شہر اور گاؤں کی از سر نو منصوبہ بندی اور دریائے جہلم کی تہہ کی کھدائی کی ۔ شعبہ زراعت کو ترقی دی۔ کسانوں کی فلاح و بہبود کو ترجیح دی۔ غلہ اُگا و مہم کی حوصلہ افزائی کی ۔ اس نے ہری پربت کے اردگرد ایک بلند اور صحت افزاء علاقہ کو راجدھانی کا درجہ دیا۔ جہلم و سندھ کے سنگم پر شہاب الدین پور کا شہر بسایا۔ جب اس شہر کو ڈھائی سو سال کے بعد جہانگیر نے دیکھا تو اپنی کتاب میں لکھا کہ شہاب الدین پور کشمیر کے مشہور مقامات میں سے ایک ایسا

زمین کا ٹکڑا ہے جہاں ایک سو خوبصورت چناروں کا جھرمٹ آپس میں اس طرح مل گیا ہے کہ درختوں کے نیچے پوری زمین پر سایہ ہی سایہ چھایا رہتا ہے یہاں تک کہ اس پر قالین بچھانا فضول اور ناقص معلوم ہوتا ہے۔ آج بھی یہ شہر شادی پور گاؤں کی صورت میں باقی ہے۔ جو چناروں کے جھرمٹ میں ایک پر کشش مقام ہے۔ علم حاصل کرنے کی حوصلہ افزائی کی۔ مذہبی رسوم ادا کرنے کی اجازت دی۔ صلاح جوئی کے جذبے کے تحت کچھ شکستہ مناروں کی مرمت بھی کروائی۔ ان سارے اوصاف کے باوجود اپنی زندگی کے آخری سال وہ ایک رنڈی کے حسن و جمال پر فریفتہ ہوا جو اس کی ملکہ کی بھتیجی تھی۔ وہ ملکہ کو اس کے دو ننھے شہزادوں کے ساتھ شہر بدر کروانے میں کامیاب ہوگئی۔ اگر چہ اس کو بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا لیکن شہر بدر ہوئے بیٹوں کے ساتھ آخری ملاقات کرنے کے بغیر شکستہ دل انسان کی طرح ۱۳۷۴ء میں داعی اجل کو لبیک کہا اور اس دنیا سے چل بسا۔

اس کے بعد قطب الدین جو ایک تجربہ کار اور تیز فہم آدمی تھا بادشاہ بنا اور اس سے پہلے بادشاہ کا وزیر اعظم بھی رہا تھا اس کے عہد میں سید علی ہمدانیؒ یہاں تشریف لائے جو ایران کے سید شہاب الدین کے لخت جگر تھے۔ اگر چہ اسلام یہاں رینچن شاہ کے عہد میں پہنچا تھا مگر اس نے سید علیؒ ہمدانی کی تشریف آوری تک پوری وادی میں کوئی نمایاں ترقی نہیں کی تھی۔ ہندوانہ روش کے اثرات ابھی تک کسی نہ کسی شکل میں پائے جاتے تھے مثلاً سلطان قطب الدین نے ایک ہی وقت دو سگی بہنوں کے ساتھ شادی کر رکھی تھی جو شریعت اسلامی کے خلاف بات تھی۔ لباس بھی ابھی تک ہندوانہ تھا۔ حتیٰ کہ سلطان خود بھی ہندو طرز کا لباس استعمال کرتا تھا۔ سید علیؒ نے سب سے پہلے قطب دین ہی کو پکڑا اور اس کو صحیح طریقے سے اسلام کا تعارف کرایا اپنی روحانی قوت سے سلطان کو متاثر کیا۔ غیر اسلامی نکاح کو منسوخ کرایا۔ صرف ایک بہن کو نکاح میں رکھوایا۔ انہوں نے سلطان کو مسلمانوں کا لباس پہننے کی ترغیب دی اور اسی طرح سلطان سے کہا کہ اپنی رعایا میں بھی اس طرز لباس کو رواج دے مسلم رعایا کے لئے شریعت کے احکام و اصول جمع کرائے۔ اپنے خاص مرید کو بادشاہ کا مذہبی اتالیق مقرر کیا اور اپنی مبارک کلاہ سلطان کو عطا کی اور اس کی نسل کو طویل بادشاہت کی دعا دی۔ انہوں نے اپنے مریدوں کو قصبوں اور گاؤں میں تقسیم کر دیا تا کہ وہ لوگوں میں عمل و وعظ کے ذریعے اپنا عقیدہ پھیلائیں اور خود سرینگر میں سلطان قطب الدین اور

3

اس کے رفقاء کو سچا اسلام سکھایا۔ سید علیؒ کشمیر میں چھ سال رہے اور پھر اسلام اور مسلم تہذیب کو مقبول بنانے کا کام اپنے مریدوں کو سونپا اور خود صحت کی خرابی کی وجہ سے کشمیر سے واپس چلے گئے اور ہزارہ کے راستے میں وفات پا گئے اور آخر پر ختلان میں دفن کیے گئے۔ چونکہ اسلام نے یہاں سید صاحبؒ کی وجہ سے قابل قدر ترقی کی اور اس کو سرکاری حوصلہ افزائی بھی ملی لیکن بہت جلد سلطان پندرہ سال کی حکومت کے بعد فوت ہوا اور قطب الدین پورہ سرینگر میں سپرد خاک کیا گیا۔ اس کی جگہ اس کے بڑے بیٹے سلطان سکندر نے لی۔ اس بادشاہ کے اکثر رفقاء اور مشیر بیہقی سادات پر مشتمل تھے۔ جو تیمور سے شکست کھانے کے بعد سید محمود بیہقی کی قیادت میں سبزوار سے کشمیر آ گئے تھے۔ آہستہ آہستہ ان کے بھائی بند بھی یہاں آنے لگے خصوصاً ایران اور اس کے ہمسایہ علاقوں پر قبضہ تیمور کے بعد ان کی مہاجرت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ایران سے مسلمان پناہ گزینوں کا دوسرا قافلہ ۱۳۹۳ء میں سید علی ہمدانیؒ کے فرزند و جانشین سید محمد ہمدانیؒ کی قیادت میں وارد کشمیر ہوا۔ سلطان سکندر نے ان کا شاہانہ استقبال کیا اخراجات کے لیے جاگیریں عطا کیں اور جس جگہ اب خانقاہ معلیٰ واقع ہے ان کے لیے وہاں ایک خانقاہ تعمیر کروائی۔ سید محمد ہمدانی نے خود بھی سلطان کے مطالعہ کے لیے دین اسلام پر ایک مختصر رسالہ قلمبند کیا۔ اس کے بعد میر محمد ہمدانیؒ بارہ سال کے قیام کے بعد یہاں سے چلے گئے۔ یہ بادشاہ حضرت میر محمدؒ کا ہم عمر تھا اور ان کے تعلقات اس وقت اور زیادہ مضبوط ہو گئے۔ جب سید محمد ہمدانیؒ نے ایک قیمتی ہیرا سلطان کے نذر کیا۔ میر محمد ہمدانی نے ایک عظیم کارنامہ اس وقت انجام دیا جب وہ بادشاہ کے وزیر اعظم سہہ بٹ کو مسلمان بنانے میں کامیاب ہوئے۔ اور اس کا نام ملک سیف الدین رکھا اور پھر اس کی لڑکی سے شادی کر لی۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ سکندر بت شکن تھا اور اس نے مندروں کو توڑ دیا تو اس میں محققین نے یہ بات بھی لکھی ہے کہ مندروں کا یہ انہدام کشمیر کی تاریخ میں کوئی منفرد واقعہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی راجہ ہرش کے زمانہ میں مالی مشکلات سے نمٹنے کے لیے مشہور مندروں نے مدد دی تھی سنہری کلسوں کو توڑ کر روپیہ میں تبدیل کیا گیا۔ سہہ بٹ کے چند مندروں کے انہدام کا مقصد یہ تھا کہ تیمور کے سفیر نے جب سکندر سے اطاعت و وفاداری کا مطالبہ کیا اور واقعی تیمور اپنی زبردست فوجی قوت سے کشمیر کے گرد نواح میں اپنا سکہ جما چکا تھا۔ ایسے حالات میں تیمور کے حریص وزراء نے سکندر سے تیمور کے لیے خراج پیش کرنے کے سلسلے میں تیس ہزار گھوڑوں اور علاؤالدین خلجی کے ایک لاکھ روپہلی ٹانک ڈھائی تولے وزن کا مطالبہ کیا۔ حالانکہ تیمور نے بذات

خود اتنا بڑا مطالبہ نہ کیا تھا بلکہ جب اس کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے افسوس کیا اور اپنے وزیروں کو حد سے زیادہ مانگ کے لیے ڈانٹ ڈپٹ کی۔اور زین العابدینؒ اور سید محمد مدنیؒ کو سلطان سکندر کے پاس یہ اطلاع دینے کے لیے بھیجا کہ وہ اٹھائیس دن کے بعد دریائے سندھ کے کنارے کوئی تحفہ لائے بغیر ہمارے ساتھ ملاقات کرے۔کیونکہ سلطنت کے مشرقی حصے میں خطرناک شورش کے سبب خود سمرقند کی طرف بھاگ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔حریص وزراء کی طلب کردہ رقم ادا کرنے کے لیے سلطان نے چند مندروں کے انہدام کا فیصلہ کیا تا کہ وہ خراج ادا کر کے ملک کو بیرونی حملہ آوروں سے بچا سکے۔گویا سلطان کا یہ اقدام اگر چہ ذاتی مفاد کے لیے نہیں تھا بلکہ سابقہ ہندو سہہ بٹ کا مشورہ تھا۔اور اسی کے پیش نظر چند مندروں کا انہدام وجود میں آیا تھا۔اس میں مذہبی تعصب کا کوئی دخل نہیں تھا بلکہ یہ قدم راجہ ہرش کی طرح ایک ملک بچاؤ منصوبہ بندی تھی۔اس کے علاوہ سلطان اس بات سے بے خبر بھی تھا کہ تیمور بادشاہ کشمیر پر چڑھائی کرنے کے بغیر ہی شمالی خطہ میں زبردست شورش کی وجہ سے واپس سمرقند جانے والا ہے۔باقی ہندوؤں کو مارنے اور بھگانے کے متعلق مورخوں نے مبالغے سے کام لیا ہے کیونکہ دین میں کسی کو زبردستی داخل نہ کرنا سلام کا ایک مشہور اصول ہے جس سے مسلمان ہی نہیں بلکہ پورا عالم باخبر ہے۔سلطان سکندر کے بعد اس کا بڑا بیٹا سلطان علی شاہ تخت نشین ہوا۔سہہ بٹ حسب سابق وزیراعظم رہا۔سہہ بٹ جو اب سیف الدین کا لقب حاصل کر چکا تھا اسلام لانے کے جوش میں بت پرستی کا زبردست مخالف بنا تھا۔اور اپنے جوش ایمان کے جذبے سے ہندوؤں کو اسلام میں داخل کرنے کا جذبہ رکھتا تھا۔یہ اسکا ایک ذاتی فعل تھا حالانکہ تاریخ میں لکھا ہے کہ حضرت میر محمد ہمدانیؒ نے سہہ بٹ کو ایسا کرنے سے منع بھی کیا البتہ جون راج نے جو سخت الزامات سہہ بٹ پر عائد کیے ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کو سہہ بٹ کا اسلام قبول کرنا دوسرے ہندوؤں کی طرح ایک آنکھ نہیں بھایا۔اس وجہ سے سکندر کے بت شکنی کے واقعات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔اگر اس بات کو سو فیصد درست مانا جائے کہ انہوں نے ظلم و بربریت سے مندرروں کا انہدام کیا تب تو آج کوئی بھی مندر کشمیر میں باقی نہیں ہونا چاہیے تھا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ سکندر کے سو برس بعد بھی وادئ کشمیر میں ایک بڑی تعداد مندروں کی موجود تھی۔مرزا حیدر دوغلت نے جس نے کشمیر میں دس سال حکمرانی کی ۹۵۳ھ میں لکھا کہ ’’کشمیر کی سب سے حیرت انگیز چیز اس کے مندر

ہیں۔ کشمیر اور اس کے آس پاس ۱۵۰ سے زیادہ مندر ہیں اور انکی جیسی طرز عمارت کی نظیر ساری دنیا میں نہیں مل سکتی۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ یہاں ایک سو پچاس مندر ہیں۔ ابوالفضل نے بھی لکھا ہے کہ کچھ مندر تو بلکل اچھی حالت میں ہیں اسی طرح جہانگیر بھی رقم طراز ہے۔ اونچے اونچے مندر جو ظہور اسلام سے پہلے تعمیر کردہ ہیں ابھی تک موجود ہیں۔ سکندر کی بت شکنی کو بہت مبالغہ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ بعض موقعوں پر تو سکندر نے مندروں کو منہدم نہیں کیا۔ بلکہ جب کبھی کسی مقام پر باشندے اسلام قبول کرتے تھے تو وہ مندر کو مسجد میں تبدیل کر دیا کرتے تھے (یعنی مندر کو توڑے بغیر) ان مندروں کی دیکھ بال نہ ہونے کی وجہ سے یہ کھنڈر بن گئے۔ کچھ مندر زلزلوں کی نذر ہو گئے۔ لیکن ان باتوں کو نظر انداز کر دیا گیا۔ کج بین تذکرہ نویسوں نے تمام منہدم مندروں کی ذمہ داری سکندر کے سر پر ڈال دی۔

رینچن، اودیان دیو اور شاہ میری دور کے ایام حکمرانی کا ایک خاکہ:

نمبر شمار	نام بادشاہ	مدت حکمرانی	مدت حکمرانی بمطابق سنہ ھجری
۱	رینچن شاہ	۳ سال	۷۲۵ھ تا ۷۲۷ھ
۲	اودیان دیو	۱۵ سال	۷۲۷ھ تا ۷۴۳ھ
۳	کوٹہ رانی	۵ ماہ	۷۴۳ھ
۴	سلطان شمس الدین	۴ سال	۷۴۳ھ تا ۷۴۷ھ
۵	سلطان جمشید	۱ سال ۱۰ ماہ	۷۴۷ھ تا ۷۴۸ھ
٦	سلطان علاء الدین	۱۲ سال ۱ دن	۷۴۸ھ تا ۷٦۱ھ
۷	سلطان شہاب الدین	۱۹ سال	۷٦۱ھ تا ۷۸۰ھ
۸	سلطان قطب الدین	۱٦ سال	۷۸۰ھ تا ۷۹٦ھ
۹	سلطان سکندر	۲۴ سال	۷۹٦ھ تا ۸۲۰ھ
۱۰	سلطان علی شاہ	۷ سال	۸۲۰ھ تا ۸۲۷ھ
۱۱	سلطان زین العابدین	۵۰ سال	۸۲۷ھ تا ۸۷۹ھ
۱۲	سلطان حیدر شاہ	۱ سال ۲ ماہ	۸۷۹ھ تا ۸۸۰ھ

۱۳	سلطان حسن شاہ	۱۱سال	۸۸۰ھ تا ۸۹۲ھ
۱۴	سلطان محمد شاہ (باراول)	۳سال	۸۹۲ھ تا ۸۹۵ھ
۱۵	سلطان فتح شاہ (باراول)	۳سال	۸۹۵ھ تا ۸۹۸ھ
۱۶	سلطان محمد شاہ (باردوم)	۹سال	۸۹۸ھ تا ۹۰۷ھ
۱۷	سلطان فتح شاہ (باردوم)	۳سال	۹۰۷ھ تا ۹۲۰ھ
۱۸	سلطان محمد شاہ (بارسوم)	۱سال	۹۲۰ھ تا ۹۲۱ھ
۱۹	سلطان فتح شاہ (بارسوم)	۳سال	۹۲۱ھ تا ۹۲۴ھ
۲۰	سلطان محمد شاہ (بارچہارم)	۱۰سال	۹۲۴ھ تا ۹۳۴ھ
۲۱	سلطان ابراہیم	۲سال	۹۳۴ھ تا ۹۳۶ھ
۲۲	سلطان محمد شاہ (بارپنجم)	۸سال	۹۳۶ھ تا ۹۴۴ھ
۲۳	سلطان شمس الدین (دوم)		
۲۴	سلطان اسماعیل شاہ		
۲۵	سلطان ابراہیم شاہ ثانی		
۲۶	سلطان نازک شاہ		
۲۷	اسماعیل شاہ وتنازعہ	۳سال	۹۵۸ھ تا ۹۶۱ھ
۲۸	سلطان حبیب شاہ	۱سال	۹۶۱ھ تا ۹۶۲ھ

نوٹ: سلطان شمس الدین دوم سے سلطان نازک شاہ تک کا زمانہ جو تقریباً چودہ سال پر مشتمل ہے میں مذکورہ بالا سلاطین تحت نمبر ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶ یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوتے رہے لیکن مجموعی طور سے اس عرصے میں بدنظمی کی وجہ سے کوئی استحکام نہیں رہا۔ اور آخر پر سلطان حبیب شاہ کے بعد حکومت پر چک خاندان کے لوگ قابض ہو گئے۔

رنچن اور شاہ میری دور کی اہم دینی شخصیات:

حضرت بلبل شاہ، للہ عارفہ، حضرت میر حسین سامانیؒ، سید جمال الدین عطائیؒ، حضرت سید کمالؒ، حضرت سید کمال ثانیؒ، حضرت سید جمال الدین محدثؒ سید محمد کاظمؒ، سید رکن الدینؒ سید فخر الدینؒ سید محمد قریشیؒ سید عزیز اللہؒ، سید محمد مرادؒ، سید احمد قریشیؒ، پیر محمد قاری المعروف حاجی محمدؒ، شیخ سلیمان شیخ احمد خوشخوانؒ، سید بہاؤالدینؒ سید محمد سراجؒ، سید محمد بیہقیؒ، سید محمد عین پوشؒ، سید بہاؤالدینؒ، سید نعمت اللہؒ، میر محمد ہمدانیؒ۔ سید محمد حصاریؒ، سید احمد سامانیؒ، سید قاضی حسین شیرازیؒ، سید محمد خاوریؒ، سید علاء الدینؒ، سید جمال الدین بخاریؒ، سید علی اکبرؒ سید نور الدینؒ، سید شہاب الدینؒ، سید حضور اللہؒ، سید حسینؒ، سید محمد لورستانیؒ، صدر الدین خراسانیؒ، سید حسین خوارزمیؒ سید محمد مدنیؒ، سید محمد کرمانیؒ، سید فخر الدینؒ سید محمد ژندہ پوشؒ، سید کمال الدینؒ، سید حسین منطقیؒ، سید محمد افضلؒ، سید حبیب اللہؒ، سید محمد خلیلؒ، سید علی اکبر ثانیؒ، سید محمد علیؒ، سید محمد ولی، سید محمد نبیؒ، مُلا احمد، مولانا کبیرؒ مولانا جمالؒ، سید حسن منطقیؒ، شیخ بہاؤالدین گنج بخشؒ، سید بدرالدین زینہ کدلیؒ، سید حسنؒ، سید نور الدینؒ زین کدلی، سید جانبازؒ، سید ہلال، بابا حاجی ادہم، سید محمد امین منطقی بیہقیؒ، سید حاجی مراد، سید حبیب اللہ کاسائیؒ، سید محمد منطقی، سید حبیب اللہ سرخابیؒ، سید شہاب الدین، سید حضور اللہ، سید حسین، سید موسیٰؒ، سید ذوالفقار، سید جعفرؒ، سید افضلؒ، سید معصومؒ، سید قاسم، سید داؤد، سید عزیزؒ، سید قاسمؒ، سید محمد بخاریؒ، شیخ نور الدینؒ، بابا زین الدینؒ، بابا بام الدینؒ، بابا لطیف، بابا نصر الدین، بابا قیام الدین، بابا عثمان اوچپ گنائی، حافظ فتح اللہ خوشخوان، حضرت سید برخوردار، شیخ شمس الدین بغدادیؒ سید جعفر، بابا پیام الدین بابا شمس الدین، شیخ پیرباز، بابا رجب الدین، بابا حیدر بٹ، بابا دریا دین، بابا الدہ مل، بابا شکر الدین، حضرت ریگی ریشی، بابا لولی حاجی، شیخ اُوتر ٹھاکور، شیخ لدی کٹور، شیخ نوری، بابا لدی گنائی، شیخ لچم ریشی، شیخ آدت ریشی، بابا حنیف الدین، شیخ نوروز ریشی، شیخ ہردی ریشی، شیخ نوندی ریشی، شیخ اسماعیل، حضرت سید احمد، سید جمال الدین بخاری، سید نصیر الدین خانیاری، بابا فتح اللہ، رہی ریشی، روپی ریشی، شیخ نیکی ریشی، میر رضی الدین، میر داؤد دوارکی، مولانا کمال الدین، مولانا نونی گنائی المعروف ملا مُلچی، مولانا شنگرف گنائی، مولانا بصیر المعروف ملا بابا۔ مولانا قاضی ابراہیم، مولانا محمد آنی، سید محمد کرمانی، شاہ کالو، ملک بلند وغیرہ۔

چک دور

انگریزی زبان کا مشہور مقولہ ہے (Coming events cast their shadow before) کہ آنے والے واقعات اپنا سایہ پہلے ہی پھیلانا شروع کر دیتے ہیں۔شاہ میری خاندان کے آخری دور میں سیاسی استحکام میں ضعف پیدا ہونا شروع ہوا۔جس کے پیچھے کچھ داخلی اور کچھ بیرونی عوامل کارفرما تھے۔کسی بھی سیاسی نظام کو برسر اقتدار آنے میں اس کے پیچھے اسی طرز کا ایک دعوتی نظام کارفرما ہوتا ہے۔اور جب وہ دعوتی نظام لوگوں کے اذہان کو متاثر کرتا ہے اور ان کی فکروں کو بدل دیتا ہے تو پھر اسی کے موافق ایک سیاسی نظام وجود میں آتا ہے اگر کبھی سیاسی چالبازی سے کوئی شخص عوام پر غلبہ حاصل کرتا ہے تو اس کی مثال ریت پر دیوار تعمیر کرنے کے مانند ہوتی ہے۔ملوکیت یا بادشاہی نظام کے پیچھے بھی ایک سیاسی فکر ہوتا ہے ۔جمہوری نظام کے پیچھے بھی ایک سیاسی فکر ہوتا ہے۔سرمایہ دارانہ نظام کے پیچھے بھی ایک سیاسی فکر ہوتا ہے۔خلافت کے پیچھے بھی ایک دینی اور سیاسی فکر کام کر رہا ہے جس کی بنیاد توحید و رسالت اور آخرت کے یقین پر قائم ہوتی ہے۔پھر جب کوئی مذہب عقیدہ یا فلسفہ عوامی مقبولیت حاصل کرتا ہے تو اس دور کا سیاسی نظام اسی مذہب ،عقیدہ یا فلسفہ کا عکس ہوتا ہے۔اسلام چونکہ دین خداوندی ہے قیامت تک انسانیت کی فلاح و بہبود کی ضمانت دیتا ہے لہٰذا اس کے سچے فدائین نے ہر زمانے میں اس نظام کو استحکام بخشنے اور سیاسی اعتبار سے اسکا صحیح مقام دلوانے کی کوشش کی ہے لیکن اس کی طاقت کا اصل سرچشمہ اسکا وہ دعوتی نظام ہے جس کے متعلق قرآن کریم ان الفاظ میں ناطق ہے **ومن احسن قولاً ممن دعا الی اللہ وعمل صالحاً وقال انني من المسلمين** (ترجمہ) اس سے بڑھ کر کس کی بات بہتر ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور خود بھی نیک اعمال کرتا ہو اور اس بات کی فخر کے ساتھ گواہی دے کہ میں عام مسلمانوں میں سے ایک مسلمان ہوں ۔لیکن یہ ایک ستم ظریفی ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں مخلصین کے ساتھ غیر

مخلصین کا ایک گروہ بھی اپنی من پسند سوچ کے مطابق معاملات میں ٹانگ اَڑاتا رہا ہے اور پھر کسی نہ کسی صورت میں حالات وواقعات کا رخ موڑنے میں سرگرم عمل رہا ہے۔ جس کا خاکہ علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفویؐ سے شرار بولہبی

سطور بالا کی روشنی میں جب ہم تاریخ کے اوراق کی ورق گردانی کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس وادی کشمیر میں خدا کے چند مخلص بندے آئے اور پھر اپنے ذاتی کردار اور شفقت علی الخلق کے جذبے کے تحت کبھی حکمرانوں پر اثر انداز ہوئے اور کبھی عوام کے دلوں کو جیتنے کے بعد ان کو صراط مستقیم کیطرف گامزن کیا۔ اور جو لوگ ان کے افکار سے متاثر ہوئے ان کو دین اسلام کے مشہور طریقے یعنی اہل سنت والجماعت کے طریقے پر ڈالا اور اسی پر قائم ودائم رہنے کی تلقین کی یہاں تک کہ تصوف کے ایک سلسلہ (نور بخشی) کے روپ میں ایک شخص وارد کشمیر ہوا۔ کیا یہ شخص نور بخشی سلسلہ تصوف میں مجاز تھا یا نہیں محققین کے نزدیک یہ ایک طے طلب معاملہ ہے لیکن یہ بات طے ہے کہ فقہی ومسلکی اعتبار سے یہ شخص شیعہ تھا یا اس مکتب فکر کا حامی تھا۔ یہ شخص عجیب وغریب علوم جانتا تھا اور یہ بھی دیگر اہل سنت سادات کی طرح یہاں اپنا دعوتی پروگرام لے کر آیا جس کا مقصد اس کی کارکردگی سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص اشاعت اسلام کے لیے نہیں بلکہ اشاعت مسلک شیعہ اور اشاعت تعلیمات نور بخشیہ کے لیے دو دفعہ وارد کشمیر ہوا پہلی دفعہ یہاں حالات وواقعات کا مشاہدہ کیا لیکن اپنے افکار وخیالات کو عوام وخواص میں کوئی عملی جامہ نہ پہنا سکا کیونکہ صدیوں سے یہاں اہل سنت کا طریقہ رائج تھا اور عوام شیعہ عقائد سے اور نور بخشی سلسلہ تصوف سے ناآشنا تھے۔ یہاں کے مسلمان یا تو سید عبد الرحمٰن نقشبندیؒ المعروف بلبل شاہ صاحب کے نام سے آشنا تھے یا سید علی ہمدانیؒ اور شیخ نور الدینؒ یعنی علمدار کشمیر کے دکھائے ہوئے راستہ پر کاربند تھے۔ شیخ نور الدینؒ کو سید علی ہمدانیؒ کے جلیل القدر فرزند حضرت میر محمدؒ صاحب کی طرف سے سند خلافت بصورت خط ارشاد حاصل ہوئی تھی اور چاروں اصحاب یعنی سید عبد الرحمٰنؒ، میر علی ہمدانیؒ، میر محمد ہمدانیؒ اور شیخ نور الدینؒ اہل سنت والجماعت کے مشہور ومعروف طریقے سے منسلک تھے۔ بادشاہوں اور برسر اقتدار امراء وروساء کے درمیان اگر اختلافات

نمودار ہوتے تھے تو ان کی نوعیت سیاسی نوعیت کی ہوتی تھی۔ دینی اور ملکی اعتبار سے فکری ہم آہنگی پائی جاتی تھی اور کشمیر پوری طرح سے آماجگاہ امن وامان تھا۔ تاریخ کی ورق گردانی سے ایسا لگتا ہے کہ کافی عرصہ تک اسی فکر ونظر کے تحت برسر اقتدار رہنے کے بعد شاہ میری سلاطین اپنے آخری ایام میں عیاشی کیطرف راغب ہوئے جس کا آخری نتیجہ یہی نکلا کہ اس عیاشی نے انکو بام عروج سے گرا کر ذلت ومسکنت میں دھکیل دیا۔ دعوتی اور شرعی امور سے صرف نظر کرنے کیوجہ سے تکوینی امور بھی ان لوگوں کے خلاف ہوئے جس کا ظہور ان کے سیاسی واقتصادی زوال اور دیگر مصائب کی شکل میں نمودار ہوا۔ ایسی ہی صورت حال کے پیش نظر علامہ اقبالؒ نے یہ مشہور شعر داغا ہے۔

آتجھ کو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر وسناں اول طاؤس ورباب آخر

یہی معاملہ شاہ میری دور کے آخری ایام میں اہل سنت والجماعت مسلک سے وابستہ ان حکمرانوں کے ساتھ پیش آیا۔ مثبت دینی محنت کے فقدان اور دعوتی سپرٹ سے محرومی کی وجہ سے نئے نئے فتنوں نے جنم لیا۔ اور شیعہ اور نوربخشی روپ میں شمس الدین (اراکی) کشمیر میں وارد ہوا۔ وہ اپنے مسلک کا ایک پرجوش مبلغ تھا۔ اس کے ساتھ نمٹنے کا ایک بہترین طریقہ یہ تھا کہ علمی بنیادوں پر اس کا مقابلہ کیا جاتا۔ اور اس کی عملی صورت جب ہی ممکن ہے کہ جب ہمارے پاس ایسے بے لوث صاحب علم ویقین مبلغین حضرات کا ایسا گروہ موجود ہو جو ایثار اور رضا کارانہ جذبات رکھتا ہو۔ اور جو صرف اور صرف خوف خداوندی اور فکر صالح کے تحت مسلمانوں کے دین وایمان کو بچانے کی کوشش میں لگا رہے۔ بدقسمتی سے اس دور میں ان اوصاف سے متصف خاطر خواہ اصحاب کی عدم موجودگی کی وجہ سے اور کچھ باہمی سیاسی رسہ کشی کی وجہ سے شمس الدین اراکی چک خاندان کے چند بااثر اور طاقت ور افراد کو اپنی گرفت میں لانے میں کامیاب ہوا اور پھر ان کی وساطت سے عامۃ المسلمین کیطرف اپنی دعوت کا رخ موڑ کر بہت سارے افراد کو اپنی فکر واعتقاد کا متوالا بنانے میں کامیاب ہوا۔ یہ بااثر اور طاقت ور افراد کون تھے؟ یہ لوگ چک خاندان کے وہ سربرآوردہ حضرات تھے جنہوں نے اپنی ہوشیاری اور پیدائشی بہادری سے شاہ میری خاندان کے اندر کافی اثر ونفوذ حاصل کیا تھا اور انکے ساتھ رشتہ داریاں قائم کرلی تھیں۔ یہ لوگ بھی پہلے سب کے

سب سنی مسلمان تھے لیکن شمس الدین کی تبلیغ کی وجہ سے اپنا مسلک تبدیل کر کے سنی سے شیعہ بن گئے اور دوسری طرف سے حکومت کا رخ موڑنے میں اور شاہ میری کھنڈرات پر اپنی عمارت تعمیر کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ سیاسی اعتبار سے شاہ میری سلاطین کے آخری دور میں جو زوال کی کیفیت باہمی مناقشوں سے پیدا ہوئی تھی اور پھر چک خاندان کے اثر ونفوذ نے اس میں جو بدمزگی پیدا کی تھی اس سے صورت حال نے پلٹا کھایا اور شیعہ مذہب کو سرکاری پشت پناہی حاصل ہو گئی انہوں نے نہ صرف شمس الدین کی تبلیغی تحریک کی تائید کی بلکہ اپنے سیاسی اقتدار کو بھی کام میں لا کر کئی سنی مسلمانوں اور ہندوؤں کو شیعہ مسلک اپنانے پر مجبور کیا۔ سنی علماء کے ساتھ ہتک آمیز سلوک کیا گیا اور ان کو طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلاء کیا گیا۔ کچھ سنی علماء ترک وطن کرنے پر مجبور ہو گئے اور کئی قتل کیے گئے اور مذہبی اور فکری اعتبار سے یہ تیس بتیس سالہ دور سنی مسلمانوں کے لیے قیامت خیز ثابت ہوا۔ یہاں تک کہ اکبر بادشاہ کی للچائی ہوئی نظریں کشمیر کی طرف اٹھنی شروع ہو گئیں اور ان حالات نے اس کو ایک سنہری موقع فراہم کیا اور حالات سے مجبور ہو کر سنی عقائد کے قائد شیخ یعقوب صرفیؒ نے دہلی کا رخ کیا اور ایک وفد کے ساتھ اکبر کے دربار میں جا کر تسخیر کشمیر کی دعوت دی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اکبر بادشاہ کی فتوحات کا سلسلہ جاری تھا اور کشمیر کے بلند قامت پہاڑ اسکو کشمیر فتح کرنے سے روکے ہوئے تھے لیکن شیخ یعقوبؒ کی دعوت نے اسکا کام ذرا آسان بنایا اور اسے یہاں ہی سے گائیڈ اور حامی مل جانے کی وجہ سے حوصلہ ملا۔ واقعہ یوں ہے کہ اگر شیخ یعقوب دہلی نہ بھی جاتا پھر بھی دیر یا سویر اکبر بادشاہ کشمیر کو فتح کرنے کے سلسلے میں ضرور کوشش کرتا کیونکہ تاریخ کی ورق گردانی سے ایسے واضح اشارے ملتے ہیں کہ اس نے اس سے پہلے ہی یہاں اپنے خفیہ اہل کار حالات و واقعات کا مشاہدہ کرنے کے لیے بھیجے تھے لیکن اس کی یہ خواہش کسی ظاہری تحریک ملنے کی منتظر تھی اور اس اقدام کا باعث اگر چہ بظاہر شیخ یعقوبؒ صرفی بنا لیکن فی الحقیقت چک خاندان کے برسر اقتدار حضرات کا وہ سخت اور ناز یبا رویہ تھا۔ جو احقر نے اپنی کتاب حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اور آخر پر یوسف شاہ چک کا وہ بزدلانہ اور غیر دانشمندانہ طرز عمل تھا جس کے تحت اس نے خود ہی اپنے آپ کو اکبر بادشاہ کی گود میں ڈالا اور پھر عمر بھر وہاں ہی قیدی بن کر رہا۔ کہتے ہیں کہ بکری کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔ یوسف شاہ چک جو پہلے ہی اکبر کے عزائم سے واقف ہو چکا تھا اگر کشمیر سے باہر نہ

جاتا اور یہاں کے اکثریتی طبقہ یعنی سنی مسلمانوں کو اپنے ہمدردانہ اور مشفقانہ طرزِ عمل سے اپناتا اور پھر سب مل کر بیرونی حملہ آوروں کو آگے بڑھنے سے روکتے تو ممکن ہے کہ مغل کشمیر پر قبضہ جمانے میں کامیاب نہ ہوتے علامہ نے صحیح فرمایا ہے۔

عداوت فرقہ آرائی تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

کشمیریوں کی باہمی رسہ کشی اور غیر حکیمانہ طرزِ عمل سے اکبر بادشاہ کو اسکے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں مدد ملی۔ اور مغل کشمیر پر قابض ہوئے جو دہلی سے کشمیر پر احکام نافذ کرتے تھے۔ مغلوں کا کشمیر کی طرف متوجہ ہونے کے لیے راہ اس وقت ہموار ہوئی تھی جب یوسف شاہ کی عیش کوشی کی وجہ سے ملک کا نظم ونسق حبہ خاتون کے ہاتھوں میں چلا جس کو یوسف شاہ نے جھونپڑے سے اٹھا کر محل شاہی تک پہنچایا تھا اور اپنی تمام دلچسپیاں موسیقی اور شاعری کے ساتھ وقف کر دیں نتیجہ یہ ہوا کہ نظم ونسق سے اسے کم لگاؤ رہ گیا تھا۔ آخر اس نے حکومت سے دست برداری اختیار کر لی۔ اور وزیر سید مبارک خان بیہقی نے حکومت سنبھالی پھر یوسف نے اکبر سے حکومت کی بحالی کے لیے مدد طلب کی اور جب راجہ مان سنگھ اور مرزا یوسف رضوی کو فوج دیکر اس کی مدد کے لیے بھیجا تو کشمیری افراد نے خود یوسف شاہ کو حکومت کی پیش کش کی۔ وہ راجہ مان سنگھ کو اطلاع دیے بغیر فوج کا ساتھ چھوڑ کر کشمیر چلا آیا اس کے پہنچتے پہنچتے کچھ امیر اپنے قول سے پھر گئے تاہم اس نے لڑ کر دوبارہ ۱۵۸۶ء میں حکومت حاصل کی۔ اکبر یوسف شاہ کے رویہ سے سخت ناراض ہو گیا اور اس نے یوسف کو اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی۔ جب یوسف کو جانے میں کچھ پس وپیش ہوا تو اس نے یوسف کو دوبارہ اپنے پاس آنے کی دعوت دی۔ پھر بھی جب یوسف کو جانے میں کچھ تامل ہوا تو اکبر نے راجہ بھگوان داس، شاہ رخ مرزا اور شاہ قلی خان کو بھاری فوج کے ساتھ کشمیر بھیجا۔ یوسف نے ڈٹ کے مقابلہ کیا۔ تاہم بھگوان داس کے سمجھانے بجھانے سے اکبر کے دربار میں جانے پر آمادہ ہو گیا۔ اکبر نے اسے اپنے دربار میں ہی رکھا اور کشمیر لوٹنے سے منع کر دیا اور قیدی بنایا معلوم ہوا کہ شیخ یعقوب صرفیؒ کی دعوت تسخیر سے بہت پہلے ہی یوسف نے مغلوں کو کشمیر کی طرف متوجہ کیا تھا۔

چک دور کے بادشاہوں کی تفصیل:

نمبر شمار	نام بادشاہ	مدت حکمرانی	ایام حکومت
۱	غازی چک	سنہ ۹۶۱ھ سے سنہ ۹۷۱ھ تک	۸ سال ۱۰ ماہ ۲ روز
۲	حسین شاہ چک	سنہ ۹۷۱ھ سے سنہ ۹۷۸ھ تک	۶ سال ۹ ماہ ۱۳ روز
۳	علی شاہ چک	سنہ ۹۷۸ھ سے سنہ ۹۸۷ھ تک	۸ سال ۲ ماہ ۲۱ روز
۴	یوسف شاہ چک	سنہ ۹۸۷ھ سے سنہ ۹۸۸ھ تک	۱ سال ۱ ماہ ۹ روز
۵	سید مبارک خان بیہقی	سنہ ۹۸۸ھ سے ......تک	۶ ماہ ۲ روز
۶	لوہر شاہ چک	سنہ ۹۸۸ھ سے سنہ ۹۸۹ھ تک	۱ سال ۱ ماہ
۷	یوسف شاہ چک (دوبارہ)	سنہ ۹۸۹ھ سے سنہ ۹۹۳ھ تک	۳ سال ۱۰ ماہ ۱۶ روز
۸	یعقوب شاہ چک	سنہ ۹۹۳ھ سے سنہ ۹۹۴ھ تک	۱ سال ۱ ماہ ۹ روز

چک دور کے علماء و مشائخ:

سید احمد کرمانیؒ، قاضی حبیب اللہ خوارزمیؒ، مُلا فیروز مفتیؒ، مُلا الماس گنائیؒ، مُلا جوھر گنائیؒ، کنکی ریشیؒ، میری ریشی، شیخ ریشی، شیخ حمزہ کشمیریؒ سید اسماعیل شامیؒ، سید میرک میر، ہردی ریشی باباؒ، شیخ نوروز ریشی، خواجہ شمس الدین پال، شیخ احمد قاری، بابا داؤد خاکی، شیخ بابا علی والی، شیخ یعقوب صرفی، خواجہ رفیق طاہر سھروردی، مولانا داؤد طوسی، میر سید مسافر، سید جمال الدین، سید محمد عین پوش، بابا مسعود سہروردی نروری، خواجہ ابراہیم کول ملارٹی،

مغل دور

[۱۵۸۶ء تا ۱۷۵۲ء]

[سنہ ۹۹۴ھ سے ۱۱۶۶ھ تک]

اس عہد میں کوئی ڈیڑھ سو ناظم (Adminstrator) مغلوں کی طرف سے کشمیر پر حکومت کرتے رہے۔ پہلا ناظم قاسم خان مقرر ہوا۔اس کو چک خاندان کے آخری بادشاہ یعقوب شاہ چک نے کافی پریشان رکھا۔آخر یعقوب چک کشمیری امراء کے پھر جانے کی وجہ سے تھک کر ہار بیٹھا۔اس پورے عہد میں کشمیر کی سیاسی زندگی میں بڑے اتار چڑھاؤ پیش آئے۔اکبر بادشاہ بذات خود کشمیر آتا رہا۔جہاں گیر کو بھی کشمیر سے عشق تھا وہ اکثر موسم بہار یہیں بسر کرتا تھا۔انہی لوگوں نے یہاں پر شالی مار، اچھبل، ویری ناگ اور چشمہ شاہی کو زینت بخشی۔ملکہ نور جہاں کے بھائی آصف خان نے نشاط باغ بنوایا۔مغلوں کو جو عشق کشمیر کے قدرتی حسن کے ساتھ تھا اس کا خاکہ ایک شاعر نے یوں کھینچا ہے۔

ازشاہ جہانگیر دم نزاع چو پرسند
باخواہش دل گفت کہ کشمیر دیگر ہیچ

ترجمہ: جب جہانگیر بادشاہ کو مرنے سے پہلے اسکی آخری خواہش کے متعلق پوچھا گیا تو جواب دیا ''کشمیر'' کے بغیر کوئی خواہش نہیں۔یعنی مرنے سے پہلے پھر ایک دفعہ کشمیر کے سیر کی خواہش ہے۔کشمیر کے حسن پر مرنے والا یہ بادشاہ کشمیر سے واپس جاتے ہوئے کشمیر سے قریب ہی بہرام گلہ میں فوت ہوا۔

شاہ جہاں کو بھی کشمیر سے بہت محبت تھی۔اس نے یہاں بہت سے رفاعی کام کیے۔اس کے بیٹے داراشکوہ کو بھی کشمیر سے گہرا تعلق رہا۔دارہ شکوہ کی بہن جہاں آرا،اور اس کی بیوی نادرہ بیگم کا قیام بھی کشمیر میں کافی عرصہ تک رہا۔مغلوں کے زمانے میں ہی آنحضرت ﷺ کا موئے مبارک کشمیر میں

بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ لایا گیا۔ جو اس وقت حضرت بل میں زیارت کا مرکز بنا ہوا ہے۔
اورنگ زیب اگرچہ زاہد تھا لیکن فطری حسن اور خوبی کے اثر سے بے بہرہ نہیں تھا۔ وہ بھی اپنی بیٹی کے ہمراہ کشمیر آیا۔ یہاں پہنچنے کے بعد اس نے یہاں کے نظم و نسق (Admintration) کی اصلاح بھی کی۔ اورنگ زیب کے بعد دہلی میں افراتفری کا دور شروع ہوا۔ اس کا لازمی اثر کشمیر پر بھی پڑا۔ بہادر شاہ سے لیکر احمد شاہ تک کشمیر پر چونتیس ناظموں نے حکومت کی۔ لیکن دہلی کے حکمرانوں کو اپنی عیش کوشی کی وجہ سے اور ایک دوسرے کے خلاف سازشوں کی وجہ سے اتنی فرصت نہیں ملی کہ وہ کشمیر آنے کی تکلیف برداشت کرتے۔ اپنے ذاتی مفاد کی وجہ سے یہ ناظم حضرات کشمیر چھوڑنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ ایسے ہی حالات میں افغان حکمران احمد شاہ درانی نے کشمیر پر حملہ کیا اور ۱۷۵۱ء سے یہاں افغان دور حکومت شروع ہوا۔

مغل دور پر تبصرہ:

مغلوں کی حکومت کشمیر پر ۱۶۷ سال رہی۔ جس کا پورا ریکارڈ نہیں ملتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک سامراجی نظامِ جہانبانی تھا۔ سامراجی نظام کا فلسفہ یہی ہوتا ہے کہ ایک زبردست ملک کسی کمزور ملک کے وسائل سے فائدہ اُٹھانے کے لیے اس پر قبضہ کرتا ہے۔ لیکن مذہبی اعتبار سے مغل چونکہ اسلام سے وابستہ تھے اور داعیان اسلام نے ہی ان کے آباو اجداد کو تاتاریت سے اپنے خلوص اور للٰہیت کی بنیاد پر اس وقت حلقہ بگوش اسلام بنایا تھا جب کوئی ظاہری طاقت ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی اور پورے عالم میں ایک تہلکہ مچایا تھا جس کے متعلق شیخ سعدیؒ نے اپنی چشم بین شہادت کی بنیاد پر اپنے مرثیہ میں یہ اشعار کہے ہیں ۔

آسمان را حق بود گر خون ببارد بر زمین
بر زوال ملک معتصم امیر المومنین
اے محمد گر قیامت می بر آری سر ز خاک
سر بر آور وایں قیامت درمیانِ خلق بین
خون فرزندانِ عم مصطفےٰ شد ریختہ
ہم براں خاکے کہ سلطاناں نہادندے جبین

(ترجمہ)

۱۔ آسمان کو حق پہنچتا ہے کہ وہ پانی کے آنسوں کے بجائے خون کے آنسوں زمین پر بادشاہ معتصم کے سلطنت کے زوال پر برسائے۔

۲۔ اے محمدؐ اگر چہ آپ روز قیامت اپنے سر مبارک سے مٹی جھاڑ کر ضرور جلوہ افروز ہو جائیں گے لیکن میری گذارش یہ ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے اس وقت بھی اپنی قبر شریف سے اپنے سر مبارک کو اٹھا کرامت کی زبوں حالی کو ملاحظہ فرمائیے۔

۳۔ آپکے چچا کی اولاد یعنی بنو عباسؓ کے شہزادوں کا خون زمین پر گرایا جارہا ہے اور یہ خون اسی زمین پر گرایا جارہا ہے جس پر اس خاندان کے شہزادے اپنی نمازوں میں پیشانی رکھتے تھے۔

لیکن جب یہ قوم اسلام میں داخل ہوئی تو ان میں دونوں طرح کے حکمران نظر آتے ہیں کچھ حکمران اچھے تھے جن کے عہد میں ریاست نے قابل ذکر ترقی کی۔ اقتصادی اور ثقافتی اعتبار سے بھی پیش رفت ہوئی لیکن آخری دور میں جو مغل حکمران حکومت پر قابض ہوئے وہ کم وبیش احمقوں کا گروہ تھا ادھر دہلی میں بھی کشمکش کا دور شروع ہو گیا تھا جس کی وجہ سے ریاست کشمیر نظر انداز ہوتی رہی اور نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اقتصادیات کو بری طرح نقصان پہنچا۔ رہزنوں نے راستوں میں ڈاکے ڈالنے شروع کیے راستے پُر خطر بن گئے خاص کر پنجاب جو کشمیر کی تجارت کا قریبی علاقہ تھا بدنظمی کا شکار ہو گیا ایسے گورنر اور ان کے نائب کشمیر پر حکومت کرتے رہے جو یہاں کے حالات وروایات سے بے خبر تھے اور کوئی خاص انتظامی تجربہ نہ رکھتے تھے وہ یہاں لوگوں سے اس طرح کا برتاؤ کرتے تھے جیسے ایک فاتح مفتوح کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ عوام کا خون چوستے تھے ذاتی فوائد اور سیر وتفریح کے لیے یہاں آتے تھے۔ اس کے علاوہ مضبوط حکومتی نظم نہ ہونے کی وجہ سے کشمیر کے اندر خانہ جنگی اور فسادات بھی ہوتے رہے۔ ایک طرف سے افراتفری کا یہ عالم تھا اور دوسری طرف زلزلوں اور سیلابوں نے کشمیر کی صورت حال کو بگاڑا۔ غربت، قحط اور لاقانونیت نے اکثر لوگوں کو وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ یہاں کے ان حالات نے تاک میں بیٹھے ہوئے احمد شاہ ابدالی کا حوصلہ بڑھایا اور کشمیر کو فتح کرنے کی ترغیب دی تا کہ اس کا الحاق افغان حکومت سے ہو جائے۔

مغل دور کے حکمران:

نمبر شمار	نام بادشاہ	مدت حکمرانی	ایام حکومت
۱	جلال الدین محمد اکبر (بادشاہِ ہند)	سنہ ۹۹۴ھ سے سنہ ۱۰۱۴ھ تک	۱۹سال ۱ماہ ۱۲روز
۲	نورالدین جہانگیر شاہ	سنہ ۱۰۱۴ھ سے سنہ ۱۰۳۶ھ تک	۲۲سال
۳	ابوالمظفر شہاب الدین شاہِ جہاں	سنہ ۱۰۳۶ھ سے سنہ ۱۰۶۸ھ تک	۳۱سال
۴	محی الدین اورنگ زیب عالمگیرؒ	سنہ ۱۰۶۸ھ سے سنہ ۱۱۱۸ھ تک	۴۹سال
۵	محمد معظم شاہ عالم بہادر	سنہ ۱۱۱۹ھ سے سنہ ۱۱۲۴ھ تک	۵سال ۱۹روز
۶	محمد معز الدین جہاندار شاہ	سنہ ۱۱۲۴ھ سے......تک	۹ماہ
۷	معین الدین محمد فرخ سیر	سنہ ۱۱۲۴ھ سے سنہ ۱۱۳۱ھ تک	۶سال ۳ماہ ۱۵روز
۸	شمس الدین ابوالبرکات رفیع الدرجات	سنہ ۱۱۳۱ھ سے......تک	۳ماہ ۱۱روز
۹	رفیع الشان ملقب شاہِ جہانِ ثانی	سنہ ۱۱۳۱ھ سے......تک	۳ماہ ۲۷روز
۱۰	ناصر الدین محمد شاہ غازی	سنہ ۱۱۳۱ھ سے سنہ ۱۱۶۱ھ تک	۲۸سال ۸ماہ ۲۰روز
۱۱	احمد شاہ معزولی	سنہ ۱۱۶۱ھ سے سنہ ۱۱۶۷ھ تک	۶سال ۳ماہ ۳روز

مغل دور کے علماء ومشائخ:

اھلہ ریشی بابا، اخوند ملا جلال، ملا کمال، شیخ عبدالکریم، حضرت میر محمد، شیخ اسماعیل چستی، شیخ محمد یوسف مانجی، خواجہ بہاوالدین محمد خوارزمی، شیخ روبی بابا ریشی، مولانا میر محمد افضل، خواجہ حسن قاری، خواجہ اسحاق قاری، شیخ حسن، شیخ بہرام گورٹنگی، شیخ حیدر لاری، شیخ بایزید شمناگی، مخدوم حاجی موسیٰ، مولانا شاہ دولت، شیخ حاجی اوتر، مولانا قاضی محمد صالح، شیخ کنکی ریشی، خواجہ مسعود پانپوری، شیخ محمد لیب، میر نازک قاری، شیخ بابا عبداللہ، شیخ بابا حاجی، شیخ بابا ابراہیم، مولانا شاہ گدائی، خواجہ حبیب اللہ نوشہری، خواجہ داؤد مجذوب، میر یوسف قاری، شیخ محمد شریف المعروف شوک بابا، مخدوم شیخ عباس، مخدوم شیخ عبداللہ، مخدوم عبدالواحد، شیخ حاجی داؤد بلخی، سید شاہ نعمت اللہ حصاری، بابا حاجی کا تجو قادری، شیخ محمد سعید، شیخ محمد، شیخ ابراہیم، میر یعقوب دار، میر حمزہ کریری، خواجہ محمد یوسف مانجو (ثانی)، شیخ موسیٰ

بلدیمری کبروی، شیخ موسیٰ زھگیر، شاہ قاسم حقانی، شیخ مہدی علی سوپوری، حضرت بابا اسحاق، مُلا حاجی گنائی، ملا حاجی بانڈے مفتی، شیخ بابا حسین، آخون مُلا حسین خباز، فیروز شاہ مجذوب، شاہ یعقوب مجذوب، خواجہ صادق ابولقاسم ملا جمالی، ملا حبیب میر عدل، مُلا علی پستک، خواجہ علی پنور رانیواری۔

اس کے علاوہ بعض ریاضت کیش رشیوں اور حقیقت آگاہ مشائخ کا ذکر اور اُن کے نام تاریخ کی کتاب ''واقعات کشمیر'' میں آئے ہیں۔

پٹھان دور

[۱۷۵۳ء تا ۱۸۱۹ء]

۱۱۶۶ء سے ۱۲۳۴ھ تک

پٹھان کون تھے؟ دریائے سندھ اور قابل کے درمیان جو پہاڑی علاقہ ہے پٹھان اسی علاقہ کے باشندے تھے اس علاقہ میں کچھ جنگجو اور بہادر قبیلے رہتے تھے مثلاً آفریدی وزیری، مہمند، سواتی اور پختون وغیرہ بنیادی طور پر یہ خانہ بدوش لوگ تھے جو کئی ذاتوں میں تقسیم تھے۔ ہندوستان میں یہ لوگ ترکوں اور مغلوں کے ماتحت فوجی خدمات انجام دیتے تھے، ان میں کچھ ایسی پیدائشی خصوصیات تھیں جنہوں نے آس پاس کے ملکوں میں ان کو ہیبت ناک بنا دیا تھا۔

نادر شاہ اور احمد شاہ

نادر شاہ ابتداء میں ایک لٹیرا تھا اور بعد میں اپنی بے نظیر جنگی قابلیت کی بنا پر ایران کا بادشاہ بن بیٹھا۔ ایرانی افغانیوں کو اپنا دشمن تصور کرتے تھے۔ اس زمانہ میں جب نادر شاہ ایران پر حکومت کرتا تھا کابل مغلیہ حکومت کا ایک صوبہ تھا۔ دہلی کے تخت پر اس زمانہ میں محمد شاہ بیٹھا ہوا تھا جو ایک مغل حکمران تھا۔ ایران کے بادشاہ نادر شاہ نے مغل بادشاہ محمد شاہ کو کئی خط بھیجے کہ وہ ایرانیوں کے دشمن افغانوں کو اپنے علاقے میں گھسنے نہ دے دہلی کا مغل بادشاہ محمد شاہ عیش وعشرت میں مست تھا وہ افغانوں کو کابل سے تو کیا نکالتا اس نے نادر شاہ کو ایک بے حقیقت انسان سمجھتے ہوئے اس کے خطوں کا جواب دینا بھی اپنی توہین سمجھا۔ نادر شاہ نے جب محسوس کیا کہ اس کے دوستانہ خطوط کا جواب تک بھی نہیں دیا جاتا ہے تو اس نے حملہ کر کے قندہار اور کابل پر قبضہ کر لیا اور دہلی کی حکومت کو اس کی خبر تک نہ ہوئی۔ جب کسی ذریعہ سے کابل وقندہار کی فتح کی خبریں دہلی پہنچیں تو بادشاہ اور امراء اس سے گپ ہی سمجھتے رہے۔ کہتے ہیں کہ کابل کو فتح کرنے کے بعد بھی نادر شاہ نے دوستانہ پیغام دے کر دہلی

کے بادشاہ کے پاس اپنے ایلچی بھیجے تھے جن کو راستہ میں ہی قتل کر دیا گیا۔ان ایلچیوں کے قتل کی وجہ ہی سے نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔کچھ لوگ ایک اور وجہ بھی بیان کرتے ہیں کہ آصف جاہ اور سعادت خان نے یہ دیکھتے ہوئے کہ مرہٹے ہندوستان کے مالک بنتے چلے جارہے ہیں نادر شاہ کو ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی۔نادر شاہ خواہ کسی کے بلانے سے ہندوستان آیا ہو یا ایلچیوں کے قتل کی بنا پر اور لوٹ مار کے لیے بہر حال اس ملک میں وارد ہوا اور جب وہ ہندوستان پہنچ گیا تو ۱۷۳۹ء میں پہلے جلال آباد کو لوٹا پھر پشاور کو برباد کیا۔اس کے بعد دریائے اٹک پار کر کے سارے پنجاب پر ہاتھ مارا۔حاکم لاہور نے اس روکنا چاہا مگر نادر شاہی فوجوں نے اس سے شکست دے دی۔جب وہ دہلی کے قریب پہنچا تب کہیں بادشاہ کو اس کے آنے کی خبر ہوئی۔محمد شاہ نے مقابلہ کے لیے ایک بڑا لشکر روانہ کیا لیکن نادر شاہ کی آزمودہ کار لشکر کے سامنے محمد شاہ کی آرام طلب فوج ٹک نہ سکی اور انہوں نے چند گھنٹوں کے اندر اندر محمد شاہ کی فوج کو کاٹ کر ڈھیر کر دیا۔امراء اور بڑے سردار مارے گئے۔اس کے بعد اگرچہ محمد شاہ اور نادر شاہ کے درمیان صلاح صفائی کرنے کی بھی دو کروڑ روپیہ کے عوض کوشش ہوئی اور نادر شاہ نے اس پیش کش کو قبول بھی کیا تھا لیکن یہاں کے امراء کی باہمی رقابت کی وجہ سے نادر شاہ کو کچھ لوگوں نے الٹی پٹی پڑھائی جس کی وجہ سے پھر ایک بار اس کے تیور بدل گئے۔نادر شاہ نے بادشاہ کو اس کی مستورات اور محل کے سارے عملہ کے ساتھ اپنے پاس بلایا۔بادشاہ کو مجبوراً نادر شاہ کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی ۔نادر شاہ نے انکو عزت کے ساتھ ایک خیمہ میں اتارا۔اس کے بعد محل کے جملہ خزانوں اور مال و اسباب کا بادشاہ سے مطالبہ کیا۔بادشاہ نے اس کو بھی منظور کیا۔اس دوران ایک افواہ اڑادی گئی کہ نادر شاہ نے محمد شاہ کو قتل کیا۔ہندوستانیوں نے اس کے انتقام میں ایرانیوں پر حملے کیے۔دوسری طرف سے یہ افواہ پھیل گئی کہ نادر شاہ مارا گیا جس کی وجہ سے شہر میں ہنگامہ شروع ہو گیا۔ایسی صورت حال میں نادر شاہ نے امن کی پیش کش کی اور خود سوار ہو کر شہر میں آیا۔عوام نے اس پر سنگ باری کی پھر کیا تھا کہ نادر شاہ نے قتل عام کا حکم دے دیا۔ایک مسجد میں بیٹھ کر ہندوستانیوں کے ذبح ہونے کا منظر دیکھتا رہا۔بازار لوٹ لیے گئے عمارتوں کو آگ لگائی گئی لوگ بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہوتے رہے۔ادھر خیمے میں ٹھہرائے گئے بادشاہ محمد شاہ کو جب اس کا علم ہوا تو آصف

جاہ اور قمر الدین خان کے ہمراہ نادر شاہ کے پاس پہنچا اور فریاد کی کہ میری رعایا کا قصور معاف فرمایئے۔نادر شاہ نے بادشاہ کی درخواست منظور کی اور خون ریزی بند کرنے کا حکم دیا۔لیکن قتل عام میں ڈیڑھ لاکھ باشندے اور سات آٹھ سو ایرانی مارے گئے۔جب امن ہوا تو محمد شاہ کی بیٹی کی شادی نادر شاہ کے بیٹے نصر اللہ مرزا سے بڑی دھوم کے ساتھ کی گئی۔جامع مسجد دہلی میں خطبے میں نادر شاہ کا نام پڑھا گیا۔ایک عہد نامہ (Agreement) ہوا جس کے مطابق دریائے سندھ کے پار کا سارا علاقہ نادر شاہ کو دیا گیا۔نادر شاہ دہلی میں اٹھاون دن رہا اور جب دہلی سے روانہ ہوا تو پندرہ بیس کروڑ کی مالیت کے جواہرات، سونے چاندی کے برتن، اشرفیاں، نقد روپیہ اور تختِ طاؤس اپنے ساتھ لے گیا اور دہلی کو ایسا ویران کر گیا کہ وہ زمانۂ دراز تک اپنی اصلی حالت پر نہ آسکی۔(بحوالہ ہندوستان پر مغلیہ حکومت صفحہ ۳۸۱)

احمد شاہ ابدالی یا درانی

نادر شاہ جب ہندوستان سے ایران واپس گیا تو اسے قتل کر دیا گیا نادر شاہ کے مارے جانے کے بعد نادر شاہ کے فوجی افسر احمد شاہ ابدالی کا بہت زور بڑھ گیا۔یہ افغانستان کے درانی خاندان کا سردار تھا۔اس نے غزنین اور قندھار فتح کر لیا۔اور اس طرح افغانستان کا پہلا بادشاہ بن گیا۔اور نادر شاہ کے زمانہ کے کابل کے صوبیدار ناصر خان سے پانچ لاکھ روپیہ کے خراج کا مطالبہ کیا۔جب اس نے پانچ لاکھ روپیہ نہیں دیا تو احمد شاہ ابدالی نے اس پر حملہ کر دیا ناصر خان بھاگ کر ہندوستان آ گیا۔احمد شاہ ابدالی اس کے تعاقب میں ۱۷۴۷ء میں پشاور آیا۔اور جب اسے معلوم ہوا کہ ہندوستان میں ابتری پھیلی ہوئی ہے تو وہ نادر شاہ کی تقلید کرتے ہوئے پنجاب کو لوٹتا ہوا ۱۷۴۷ء میں لاہور پہنچ گیا اور لاہور و سرہند پر قبضہ جما لیا۔اس کے بعد دہلی کی جانب بڑھنا چاہتا تھا کہ ولی عہد سلطنت سلطان احمد شاہ ابن محمد شاہ ایک لشکر لیکر اُسکے مقابلہ پر جاڈٹا۔اور بڑے سخت معرکہ کے بعد ۱۷۴۸ء میں احمد شاہ ابدالی کو شکست دی۔لیکن احمد شاہ نے پھر دوسرا اور اس کے بعد تیسرا حملہ دہلی پر کیا۔اور ۱۷۵۷ء میں دہلی پر قابض ہوا۔سارے شاہی اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔خوب روپیہ گھسیٹا نادر شاہ کے لوٹ مار سے زیادہ تباہی مچائی۔محمد شاہ کی ایک خوبصورت بیٹی سے شادی کر لی۔اپنے بیٹے تیمور کی شادی بادشاہ کی بھتیجی سے کی۔خوب لوٹ مار کر کے واپس قندھار چلا۔چوتھی بار بھی احمد شاہ ہندوستان

آیا اور پنجاب میں سکھوں اور مرہٹوں کی خوب مرمت کی ۔پانی پت میں لاکھوں مرہٹے مارے۔جنہوں نے ہرطرف لوٹ ماراور غارتگری کا بازار گرم کیا تھا۔ان مرہٹوں کی طاقت کو کچل کر احمد شاہ ابدالی نورالدین خان کو لاہور میں اپنا نائب مقرر کر کے واپس چلا اور پھر کبھی ہندوستان نہیں آیا۔

انہی ایام میں جب احمد شاہ درانی لاہور میں مقیم تھا۔اس نے اہالیان کشمیر کی تحریک سے کشمیر کی طوائف الملو کی اور سیاسی عدم استحکام کو مٹانے کے لیے اپنے ایک جرنیل عبداللہ خان ایشک اقاصی کو پندرہ ہزار کا لشکر جرار دے کر جس میں افغان اور سرحدی لوگ شامل تھے کشمیر پر حملہ کی غرض سے بھیجا۔احمد شاہ نے یہ حملہ اہالیان کشمیر کی تحریک پر ہی کیا۔لہذا ۱۷۵۳ء میں احمد شاہ ابدالی نے زوال مغلیہ سے فائدہ اُٹھا کر کشمیر پر قبضہ کرلیا۔قریباً چھیاسٹھ سال یعنی ابتدائے ۱۸۱۹ء تک کشمیر پر افغانوں کا غلبہ رہا۔کشمیر میں افغان ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے لیکن پھر ان کی اکثریت نے کشمیر ہی میں سکونت اختیار کی اور اسی کو اپنا وطن بنالیا جسکی وجہ سے ان کے قومی وملکی خصائل ان سے جاتے رہے۔آج کشمیر کے قدیم مسلمانوں اور افغان مسلمانوں میں بظاہر کوئی فرق نظر نہیں آتا۔جس وقت احمد شاہ درانی کے ایک جرنیل عبداللہ خان ایشک اقاصی نے کشمیر پر دھاوا بولا اس وقت یہاں ابوالقاسم گورنر تھا جس نے میر مقیم کنٹھ کو شکست دے کر حکومت پر قبضہ کرلیا تھا اس پر آزردہ و نا مید اور خودغرض اور غیر محبّ وطن کشمیری لیڈر میر مقیم کنٹھ اور خواجہ ظہیر الدین دیدہ مری نے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اپنے نمائندے احمد شاہ ابدالی کے پاس بھیجے اور درخواست کی کہ وہ کشمیر کو فتح کر کے اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لے۔احمد شاہ ابدالی نے جو کشمیر کو پہلے ہی سے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا تھا اس پیشکش کو قبول کیا۔اور ابوالقاسم نے بمقام شوپیان افغان فوج کا مقابلہ کیا۔پندرہ دنوں تک جنگ جاری رہی آخر کار ابوالقاسم کوسکشت ہوئی۔اسے گرفتار کر کے کابل بھیج دیا گیا۔عبداللہ خان ایشک ہری پربت میں فاتحانہ داخل ہوااور اس طرح ۱۷۵۳ء میں کشمیر میں پٹھان حکومت قائم کی گئی۔

پٹھان حکومت کے حکمران

ریاست کشمیر چھیاسٹھ سال تک چار افغان بادشاہوں کے ماتحت رہی جن کی تفصیل اس طرح ہے:

نمبر شمار	نام بادشاہ	مدت حکمرانی
۱	احمد شاہ ابدالی	۱۱۶۶ء سے ۱۱۸۶ھ تک (۱۹ سال ۴ ماہ ۲۷ روز)
۲	تیمور شاہ درانی (ابدالی)	۱۱۸۶ھ سے ۱۲۰۷ھ تک
۳	زمان شاہ درانی	۱۲۰۷ھ سے ۱۲۱۶ھ تک (۸ سال ۱۰ ماہ
۴	محمد شاہ درانی	۱۲۱۶ھ سے ۱۲۳۴ھ تک (۱۷ سال ۲ ماہ)

ان باشاہوں کی سربراہی میں ۲۸ گورنروں اور ڈپٹی گورنروں نے یہاں حکومت کی چند صورتوں میں بیٹا باپ کا جانشین ہوا، بعض صورتوں میں گورنر آزادانہ حکومت کرتے رہے۔ مگر سبھی گورنر پٹھان نہ تھے۔ پہلی دفعہ ایک ہندو راجہ سکھ جیون مل کا نام بھی ملتا ہے جس نے آٹھ سال سے زیادہ عرصہ کے لیے حکومت کی۔ وہ دیگر پٹھان گورنروں سے زیادہ مقبول رہا۔ افغان گورنروں میں تو کچھ آئین کے بے حد پابند اور انسان دوست تھے لیکن کچھ گورنروں نے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا اور دونوں کا لہو چوسا۔ چند موقعوں پر وہ شیعہ سنی جھگڑوں کا سبب بنے۔ جب بھی نظم ونسق میں کوئی کمزوری ظاہر ہو جاتی تو پہاڑی خان جن میں گوجر، بمبہ، اور کھکھ شامل تھے وادی میں گھس جاتے تھے اور آتش زنی اور قتل عام کرنے کے بعد لوٹ جاتے تھے۔ کچھ پٹھان حکمران دہشت پسندی کا بدترین نمونہ تھے۔ مورخوں کے مطابق ان کی حکومت سب سے زیادہ ظالمانہ اور مکروہ تھی۔ جب حالات ناقابل برداشت ہو گئے تو ایک کشمیری پنڈت بیربل در پنجاب کے حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ کے پاس گیا اور اسے فتح کشمیر کی درخواست کی۔ اسکی اپیل منظور کی گئی اور مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کشمیر کو ۱۵ جون ۱۸۱۹ء کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔

مسلم دورِ حکومت پر تبصرہ:

وادی کشمیر تقریباً ۱۲۰ کوس طول اور دس سے بیس کوس عرض پر پھیلی ہوئی چھوٹی سی ریاست ہے۔ ہندو اقتدار کے عروج کے دنوں میں اسکی علاقائی حدود اسکی قدرتی حدود سے آگے پھیلی ہوئی تھیں لیکن جے سنگھ کی موت کے بعد ہندو اقتدار کو پھر زوال آیا اور جب ۱۳۲۰ء میں بودھ راجہ رنچن نے اسلام قبول کیا اور وہ صدر الدین کے نام سے سلطان بنا اور کشمیر کی آزاد مسلم حکومت کی بنیاد رکھی تو حالات کچھ زیادہ تبدیل نہیں ہوئے۔ بیس سال کے وقفہ کو چھوڑ کر جب شاہمیر کے عہد سلطنت کی قوت آہستہ آہستہ بڑھنے لگی ایک دفعہ پھر کشمیر کے بادشاہوں نے ہمسایہ ریاستوں پر اپنا کنٹرول بحال کرلیا۔ شاہ میری سلطان شہاب الدین نے للتادت کے نقش قدم پر چل کر ہمسایہ ریاستوں پر اپنی حکومت قائم کرلی اور زین العابدین نے لداخ و بلتستان پر قبضہ کرلیا۔ مگر زین العابدین کے تابناک دور کے بعد سیاسی بدنظمی کا دور شروع ہوا۔ حالات نے کاشغر کے مرزا حیدر دوغلت کی سرکردگی میں ۱۵۳۳ء میں کشمیر پر حملے کو آسان بنادیا۔ پھر لودھی، شیر شاہ سوری، اور بر صغیر کے پہلے دو مغل حکمرانوں نے بھی اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن اپنی مقامی مصروفیات کی وجہ سے وہ کشمیر پر قبضہ قائم نہ کرسکے لیکن اس کے باوجود جب بھی کشمیر میں کوئی ناراض یا شکست خوردہ کشمیری لیڈران سے یہاں مداخلت کرنے کی سازش کرتا تو یہ کشمیر کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرتے تھے۔ اسی طرح مرزا حیدر دوغلت اس ملک پر قبضہ کرنے اور دس سال تک حکومت کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس کے بعد اکبر نے پہلے کشمیر کو فتح کیا اور پھر ۱۵۸۶ء میں اپنی سلطنت سے اس کا الحاق کردیا۔ پھر تیسری مرتبہ احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۵۳ء میں یہاں پٹھان حکومت قائم کی جس کا خاتمہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ہاتھوں ۱۸۱۹ء میں ہوگیا۔

بیربل کا مختصر تعارف:

جس وقت افغان گورنر فتح محمد خان کشمیر پر حکومت کررہا تھا اس وقت پنجاب میں مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنی حکومت اور ملک کو وسعت دینے کے لیے بے قرار تھا۔ اس کی نظریں کشمیر کی طرف اٹھنی شروع ہوگئیں جیسا کہ قدیم روایات کے مطابق راجاؤں اور مہاراجوں کا وطیرہ رہا

ہے۔ پنڈت قوم کے لوگ لکھے پڑھے تھے ادھر کشمیری مسلمان عموماً اور پنڈت خصوصاً پٹھانوں کے ظلم و ستم سے تنگ آچکے تھے۔ تین ماہ کی حکومت کے بعد فتح محمد خان اپنے مالی مشیر نند رام تیکو (جو ایک پنڈت تھا) کے ہمراہ کابل چلا گیا۔ ملک کی بھاگ اپنے بھائی سردار محمد عظیم خان کے سپرد کی۔ اٹک کا قلعہ جو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنی تحویل میں لیا تھا اس سے واپس لینے کی کوشش کی مگر ناکام ہوکر اسے مجبوراً کابل جانا پڑا۔ اس کے علاوہ کشمیر کے گورنر سے آٹھ لاکھ روپیہ جو خراج کی دوسری قسط بنتی تھی مہاراجہ رنجیت سنگھ کو نہ ملی جس کی وجہ سے وہ آگ بگولا ہوا اور ۱۸۱۴ء میں جرنیل دل سنگھ کو بھاری فوج دیکر تسخیر کشمیر کے لیے روانہ کیا۔ جب سکھ آرمی نے پیر پنچال پہاڑ میں واقع درہ بہرام گلہ سے وادی میں داخل ہونے کی کوشش کی تو آگے پٹھان اور کشمیر کی فوجیں بڑی تعداد میں تھیں۔ سکھ جو ہلکے پھلکے کپڑوں میں ملبوس تھے اچانک موسم کی تبدیلی کی وجہ سے پریشان ہوگئے۔ ان کا گولہ و بارود نا قابل استعمال ہوگیا ساز وسامان بہہ گیا۔ اور وہ کشمیری فوج کے ہاتھوں میں آگیا۔ تین ہزار سکھ سپاہی ہلاک کردیے گئے۔ کچھ سنبھلنے کے بعد دوسرا حملہ کیا لیکن اس بار بھی ناکام ہوگئے اور پھر بالکل ہی بھاگ گئے۔ اور عظیم خان اپنی دارالحکومت میں پھر فاتحانہ انداز میں داخل ہوا۔ لیکن دوسری طرف سے رنجیت سنگھ کے ایک اور حملے کا اندیشہ بھی تھا۔ تیسری طرف سے وہ کشمیری پنڈتوں کو بھی مشکوک نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ لکھا ہے کہ نند رام جو ابھی کابل میں تھا اس کا تختہ الٹنے کے منصوبے بنا رہا تھا اور کابل میں اس مسئلے پر وہاں کے دیگر سرداروں کے ساتھ بات چیت کا آغاز کرچکا تھا۔ ان حالات میں عظیم خان نے پنڈتوں کو سزا دینے کا فیصلہ کرلیا۔ نند رام کے بھائی ہرداس تیکو کو بہت مارا پیٹا۔ تاہم اس کے لیے پنڈت افسروں کے بغیر حکومت چلانا ناممکن تھا۔ دوسری طرف سے ناسازگار موسمی حالات کی وجہ سے غذائی اجناس غائب ہوگئیں اور ایک خروار کی قیمت پندرہ روپے ہوگئی ۱۸۱۳ء قحط کا بدترین سال تھا۔ اپنی حکومت کے آخری برسوں میں اعظم خان نے تین پنڈت سرداروں کی تقرریاں کیں، بیربل دھر، مرزا پنڈت دھر اور سکھ رام کو Revenue کا کلکٹر مقرر کیا گیا۔ قحط اور ناسازگار موسمی حالات کی وجہ سے ایک لاکھ روپیہ کی رقم پنڈت بیربل در کے نام باقی رہی۔ گورنر نے اس کے خلاف سخت طریقہ اختیار کیا۔ پنڈت نے کہا کہ اسے قدرتی قحط کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ دوسری طرف سے سکھوں کے ساتھ سازش کا بھی اس پر شک کیا گیا۔ عظیم خان کے ظلم وستم کی وجہ سے بیربل در بھاگا اور مہاراجہ

رنجیت سنگھ کے سامنے اہالیان کشمیر کی طرف سے عموماً اور ہندوؤں کی طرف سے خصوصاً عظیم خان کی جابرانہ حکومت کے خلاف سائل کی حیثیت سے پیش ہوا۔ بیربل ایک زبردست سیاست دان تھا۔ ادھر اس کے تعلقات جموں کے راجہ گلاب سنگھ کے ساتھ پہلے سے تھے۔ اس کو بھی اعتماد میں لیا۔ راجہ گلاب سنگھ نے اس کی سکیم میں بڑی دلچسپی لی اور اسے کامیابی کی امید دلائی۔ کیونکہ راجہ گلاب سنگھ کا بھائی راجہ دھیان سنگھ ان دنوں مہاراجہ رنجیت سنگھ کا وزیر اعظم تھا اس نے دھیان سنگھ کے نام ایک تعارفی خط دیا اور لاہور تک کے سفر کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ دوسری طرف سے جب عظیم خان بیربل کا سراغ نکالنے میں ناکام رہا تو مرزا پنڈت کو پکڑا جس نے بیربل در کی ضمانت دی تھی۔ اس نے صاف کہا کہ وہ کشمیر میں نہیں ہے۔ شاید وہ جان بچانے کے لیے چلا گیا ہے۔ یا تو وہ مایوس ہو کر ہردوار یوپی گیا یا پھر رنجیت سنگھ کے پاس تمھارے خلاف سکھ آرمی لانے کے لیے گیا ہوگا۔ باقی جو ضمانت میں نے دی تھی اس سلسلے میں بذات خود موجود ہوں تم میری گردن اڑا سکتے ہو عظیم خان نے عقلمندی سے کام لیتے ہوئے اسکی تو جان بخشی کی لیکن بیربل اور ایک دوسرے شخص قدوس گوجر کے خاندان کو خوب نشانہ بنایا۔ بیربل کی عمر رسیدہ اور کمزور بیوی نے خودکشی کی نوجوان بہو جو بچ گئی اسے کابل بھیج دیا گیا ایک اور پنڈت وسہ کاک در کو جس نے روپوشی کا انتظام کیا تھا قتل کیا گیا۔ لیکن جب عظیم خان کو پتہ چلا کہ بیربل در اپنے مشن میں کامیاب ہو گیا ہے۔ تو اس پر لرزہ طاری ہوا جان بچانے کے لیے ۱۸۱۹ء میں وہ فوراً کشمیر سے بھاگا۔ اپنا خاندان اور ایک کروڑ روپیہ نقد اور سامان پنڈت سنہرام سپرو کے سپرد کیا اور ملک اپنے بھائی جبار خان کے حوالے کیا۔

اعظم خان اور میرزا پنڈت کا ایک دلچسپ مکالمہ:

یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکالمہ درج کیا جائے جو بیربل کے بھاگ جانے کے بعد اس کے ضامن میرزا پنڈت اور عظیم خان کے درمیان ہوا۔

عظیم خان نے سوال کیا:

”بیربل کجا رفت؟“

ترجمہ: بیربل کہاں گیا؟

میرزا پنڈت نے جواب دیا:

''ہر گاہ او را ہوس دنیا نماندہ باشد بہ گنگا خواہد رفت۔ اگر ہوس دنیا باقی باشد، پس پیش رنجیت سنگھ رفتہ ،فوج گرفتہ می آید۔''

ترجمہ: اگر اس کو دنیا کی خواہش نہ ہوگی تو گنگا کی طرف ''فقیرانہ زندگی'' گذارنے کے لیے گیا ہوگا۔ اور اگر دنیا کی ہوس ہوگی تو جان لو وہ رنجیت سنگھ کے پاس گیا ہوگا۔ اپنے ساتھ اسکی فوج لائے گا۔

سردار نے پوچھا:

''پس چہ صلاح؟''

ترجمہ: پس کیا کرنا چاہیے؟

اس نے جواب دیا:

''کشتنِ میرزا پنڈت۔''

میرزا پنڈت کو قتل کرنا چاہیے۔ جو اسکا ضامن ہے۔

عظیم خان نے سوال کیا:

''بقایا می بیربل؟''

ترجمہ: بیربل کی بقایا رقم کون ادا کرے گا؟

میرزا پنڈت نے جواب دیا:

''بنام میرزا پنڈت''

ترجمہ: وہ میرزا پنڈت کے نام ڈالی جائے۔

اس برجستہ سوال پر عظیم خان خاموش ہوگیا۔

<u>(نوٹ) قارئین اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ یہ شخص جو بیربل کے نام سے مشہور تھا۔ ایک کشمیری پنڈت تھا اور اکبر بادشاہ کے دور کا بیربل ایک دوسرا ہندو تھا۔</u>

کشمیر پر سکھوں کا قبضہ:

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے چار آزمودہ کار جرنیلوں کو کشمیر فتح کرنے کے لیے منتخب کیا

۱۔ دیوان مصر چند

۲۔ ہری سنگھ نلوا

۳۔ سردار جوالا سنگھ

۴۔ جموں کا راجہ گلاب سنگھ

اس کے علاوہ فوج کے اس ہراول دستہ کے ساتھ بیر بل در بھی تھا۔ مہاراجہ نے بیر بل در کے بیٹے راج کاک در کو لاہور میں ضمانت کے طور پر روک دیا تھا کہ آیا اس کے والد کے ارادے مخلصانہ ہیں یا نہیں۔ جبار خان نے مقابلہ کیا لیکن ناکام رہا۔ بزدل آدمی کی طرح بھاگ کر سرینگر پہنچا۔ جو چیز ملی سمیٹ کر کشمیریوں کو ان کے مقدر کے حوالہ کرتے ہوئے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کشمیر سے چلا گیا۔ اور اس طرح ۱۵ جون ۱۸۱۹ء کو پٹھان حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے جرنیل سرینگر کے شیر گڑھی قلعہ میں داخل ہو گئے۔ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کو فتح کی خوشخبری ملی تو اس نے پنڈت راج کاک در کو خلعت عطا کر کے کشمیر لوٹ جانے کی اجازت دی۔ کشمیر میں پٹھان اقتدار کے زوال سے تاریخ کا نیا باب شروع ہوتا ہے۔ ایک نیا معاشرہ اور نیا نظام وجود میں آیا جو ایک سو اٹھائیس سال تک برقرار رہا۔

سکھ کب سے کشمیر میں نمودار ہوئے:

سکھ کب سے کشمیر میں نمودار ہوئے؟ اس کی تفصیل تاریخ اقوام کشمیر میں محمد دین فوق نے اس طرح لکھی ہے کہ "عام طور پر مشہور ہے۔ کہ ۱۸۱۹ء یعنی سکھوں کے حملہ کشمیر سے پیشتر کشمیر میں کوئی سکھ نہ تھا، لیکن تاریخ اور واقعات اس کی تردید کرتے ہیں، جس کی تفصیل اس طرح ہے۔

احمد شاہ ابدالی کے زمانہ میں ۱۷۵۱ء و ۱۷۶۲ء کے مابین راجہ سکھ جیون کشمیر کا گورنر تھا۔ پہلے تو وہ افغان بادشاہوں کی متابعت کرتا رہا، لیکن جب ۱۷۵۷ء میں پنڈت مہانند جو در اُس کا مدار المہام (وزیر اعظم) بنا تو گورنر نے خودسری بلکہ خود مختاری کرنے کے لیے پنجاب کے علاقہ

پوٹھو ہار اور کوہستان ملحقہ سے پنجابی برہمنوں کو کشمیر میں بلوا کر فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا۔ان برہمنوں میں سکھ اور کئی غیر سکھ تھے مسلمان ان ایام میں سخت اذیت و مصیبت کی زندگی بسر کرتے تھے ۔ایک بلخی شہزادہ راجہ سنگھ جیون کے زیر سایہ سرینگر میں اپنی جماعت کے ہمراہ زندگی بسر کر رہا تھا۔اس کو بھی راجہ سے شکایات ہونے لگیں ۔چنانچہ ایک دفعہ شہزادہ اپنے چند ہمراہیوں سمیت راجہ کے پاس خلوت میں تھا کہ اس نے چھری کے وار سے راجہ کو زخمی کر دیا۔اسی اثنا میں اتفاق سے راجہ کے چند سکھ سپاہی آگئے ۔انہوں نے یہ کیفیت دیکھ کر شہزادہ اور اس کے ہمراہیوں کو وہیں قتل کر دیا۔اور زالڈگر (نواب بازار) سے پاندان تک تباہی مچادی۔

۱۷۸۱ء میں حاجی کریم داد خان کشمیر کا گورنر تھا۔اس کی فوج کے ایک افسر کا نام سردار دیوان سنگھ تھا۔اور خان کھکھ کے مقابلہ میں حاجی کریم دار خان نے جو فوج بھیجی تھی ۔اس کا افسر دیوان سنگھ ہی تھا۔جو اس جنگ میں مارا گیا تھا۔

افغانی عہد میں کشمیری پنڈتوں کی طرح سکھوں کو بھی بڑا عروج رہا ہے ۔فوجوں کے علاوہ ملک کے نظم ونسق میں بھی ان کا بڑا دخل تھا، جب نور الدین خان بامزئی گورنر کشمیر کو ۱۷۶۶ء میں بادشاہ نے کابل میں بلوا بھیجا۔تو اس نے انتظام حکومت کے لیے دو آدمیوں کی ایک کونسل بنائی جن میں ایک اس کا بھانجا جان محمد خان تھا۔اور دوسرا سردار گورمکھ سنگھ تھا، جس کی قابلیت پر گورنر کو بڑا اعتماد تھا۔

اس کے بعد سکھوں کا نام تاریخ کشمیر میں ۱۸۱۹ء میں دیکھا جاتا ہے ۔یہ وہ زمانہ تھا، جب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کشمیر پر حملہ کیا اور افغانوں کو شکست دی ۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد حکومت میں پنجابی برہمنوں اور پنجابی سکھوں کو جو فوج یا دوسرے محکموں میں ملازم تھے نقدی کے بجائے تنخواہ جنس میں ملا کرتی تھی ، جب سکھوں کے زمانہ میں پنجابی برہمنوں نے جو عموماً قوم یال اور دت بالی قوم سے تھے ۔سکھ مذہب قبول کر لیا۔تو جنس میں تنخواہ لینے کی رعایت سے یہ سب جنسی سکھ کہلانے لگے۔ان کا اصل وطن راولپنڈی اور جہلم کے اضلاع میں ہے۔ان کی آبادی کشمیر میں زیادہ تر پرگنہ ترال حمل، کروہن مٹن اور بڈگام میں پائی جاتی ہے۔

جنسی سکھوں کے متعلق لارنس صاحب نے خوب تحقیقات کی ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ پنجاب کے یہ سکھ برہمن جن کو کشمیر میں رہتے ہوئے ایک صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے۔اپنے بالوں کی

آراستگی کے باعث کشمیر کے برہمنوں سے بہت جلد پہچان لیے جاتے ہیں۔ نیز ان کا کشمیری لہجہ بھی ایسا صاف اور عام نہیں ہے جیسا کشمیری پنڈتوں کا ہے۔

کشمیر کا سکھ جنسی ہے یا غیر جنسی وہ بالعموم زمیندار ہے، لیکن لارنس صاحب لکھتے ہیں۔ وہ اور فصلیں تو اچھی پیدا کر لیتے ہیں۔ مگر عمدہ چاولوں کے پیدا کرنے میں کشمیری زمینداروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

کشمیر کا سکھ سکھوں کی حکومت کے زمانہ اور اس سے قبل افغانی عہد میں ایک مقتدر قوم کا فرد تھا۔ افغان حاکموں اور سکھ حکومت کے ناظموں کے زمانہ میں وہ فوج کا ایک ضروری جز و سمجھا جاتا تھا، لیکن ڈوگرہ عہد حکومت میں اس کی حیثیت ایک مزدور یا چپراسی سے زیادہ نہیں دیکھی گئی۔ راقم الحروف نے خود دیہاتی سکھوں کو سرخ پگڑیاں باندھے سڑکوں پر روڑی کوٹتے اور پنڈتوں اور پنجابی ہندوؤں کے ہاں برتن صاف کرتے دیکھا ہے اور اب بھی جہلم ویلی روڑ پر اس کی مثالیں مل سکتی ہیں۔ مگر اب کچھ عرصہ سے تعلیم کی بدولت سکھوں نے دفتروں میں بھی جگہ حاصل کر لی ہے۔ بارہمولہ اور سرینگر میں ان کے بہت بڑے دیوان ہیں سنگھ سبھائیں موجود ہیں کشمیر کے دوسرے فرقوں کی طرح یہ فرقہ بھی اب بیدار ہو چکا ہے۔ ان میں ذیلدار بھی ہیں نمبردار بھی ہیں۔ ان کا جسم اگر چہ پنجابی سکھوں کی طرح مضبوط نہیں رہا۔ تاہم وہ بدنما نہیں ہے اور اس کے خدو خال اور اس کی رنگت سے اس کی کشمیریت ٹپکتی ہوئی صاف معلوم ہو رہی ہے جنسی سکھوں کے متعلق لارنس صاحب لکھتے ہیں کشمیری مسلمانوں سے یہ اکثر جھگڑتے رہتے ہیں۔ اور چونکہ عموماً جاہل ہوتے ہیں۔ اس لیے کاشتکار جنسی سکھ اپنے مالک کو بہت تکلیف دیتا ہے بلکہ یہ لوگ آپس میں بھی ایک دوسرے کا قافیہ تنگ کرتے رہتے ہیں۔

زمینداری سکھ ان سکھوں کو کہتے ہیں جو مہاراجہ رنجیت سنگھ اور ان کے جانشینوں کے عہد میں کشمیر میں آئے۔ ان کی آبادی زیادہ تر مٹن (جنوبی کشمیر) اور چوگل (شمالی کشمیر) کے علاقوں میں ہے جنسی سکھوں اور زمینداری سکھوں کی سوشل رسومات میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ بلکہ ایک فرقہ دوسرے فرقہ میں رشتہ داری بھی نہیں کرتا۔ بعض زمینداری سکھ اپنے لڑکے لڑکیوں کی شادیاں اب تک پنجاب میں ہی کرتے ہیں۔

زمینداری سکھوں نے پنجابی لباس اور پنجابی زبان کو برابر برتا تا کہ وہ زندہ رہے۔اور ہر چند کہ ان کی کاروباری زبان کشمیری ہے، لیکن گھروں میں وہ پنجابی زبان ہی استعمال کرتے ہیں ان کا لباس بھی پنجابی ہی ہے۔البتہ جنسی سکھوں کی عورتوں نے پنجابی کرتہ کی بجائے پھرن کا کشمیری لمبا کرتہ اختیار کر لیا ہے۔اور سکھ عورت ہندو اور کشمیری مسلمان عورتوں سے علحدہ امتیازی شان کی بدولت جلد پہچان لی جاتی ہے۔

سکھوں کا عہد

۱۲۳۴ھ سے ۱۲۶۲ھ تک

۱۲۳۴ھ سے ۱۲۶۲ھ تک

کشمیر میں سکھوں کی حکومت کا زمانہ اٹھائیس سال پر حاوی ہے۔اس دوران گیارہ ناظم مقرر ہو کر کشمیر آئے ۔ پہلے ناظم دیوان مصر چند نے کشمیر سے افغانوں کے اقتدار کے آخری آثار کو مٹانے اور سکھوں کا تسلط مستحکم کرنے کا کام انجام دیا۔دوسرے ناظم دیوان موتی رام کے دور میں پنڈت بیر بل در کو مالیات کا افسر مقرر کیا گیا۔موتی رام کے جانشین سردار ہری سنگھ نلوہ کے دورِ نظامت میں بھی بیر بل در اپنی خدمت پر مامور رہا،لیکن اس کی ترقی نے در فرقے کے ایک فرد پنڈت گنیش در کو اس کا دشمن بنا دیا۔اس نے سردار ہری سنگھ نلوہ کے پاس مخبری کی کہ بیر بل در پہاڑی سرداروں کے ساتھ سازش کر کے سکھوں کی حکومت کا تختہ الٹنا چاہتا ہے۔مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جب یہ خبر سنی تو بیر بل در کو ملازمت سے برطرف کر دیا اور اس کی ساری املاک ضبط کر لیں ۔اس طرح اس مطلق العنان راجہ کے ہاتھوں وہ اپنی زندگی کا آخری زمانہ کرب و افلاس میں کاٹنے پر مجبور ہو گیا،جس کو اس نے کشمیر کی حکومت دلائی تھی۔

۱۸۲۶ء میں زبردست خان حاکم مظفر آباد نے کشمیر کو سکھوں کے تسلط سے آزاد کرانے کی کوشش کی،اس کی کوششیں ناکام رہیں۔۱۸۱۳ء میں سردار بھما سنگھ ناظم ہو کر آیا۔اس کے زمانہ کا مشہور واقعہ،سید احمد بریلوی اور ان کے ساتھی جانبازوں کی بھارت کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرانے کی کوشش کی تھی،اور چونکہ سکھ انگریزوں کے حلیف (مددگار) تھے،اس لیے ان کے مقابلے پر آ گئے اور جانبازوں کے خلاف کشمیر کی راہ میں رکاوٹ بنے اور بالاکوٹ کے مقام پر لڑائی میں سید احمد شہید ہوئے اور ان کے پیرو منتشر کر دیے گئے۔

کرنل میہان سنگھ،سکھ ناظموں میں سب سے زیادہ قابل تھا۔اس نے عوام کی بھلائی کے بہت سے کام کیے اور لوٹ مار جو سکھ فوجوں کی عادت بن گئی تھی،اس نے انھیں اس سے روکا۔اس

پر فوجیوں نے بغاوت کر دی اور رات کو سوتے میں کرنل کو قتل کر دیا۔ رنجیت سنگھ نے، گلاب سنگھ کو اس بغاوت کے فرو کرنے کے لیے مقرر کیا۔ اس نے بغاوت تو فرو کر دی، لیکن کشمیر پر تسلط کا خیال اس کے ذہن میں سما گیا۔ چنانچہ رنجیت سنگھ کے بعد، جب سکھ سلطنت میں افراتفری مچ گئی تو انگریزوں کے علاقے پر سکھوں نے حملہ کر دیا، لیکن انہیں شکست ہوئی اور تاوان کی رقم کے معاوضے میں لاہور کی حکومت نے کشمیر انگریزوں کے حوالے کرنا چاہا۔ راجہ گلاب سنگھ کے لیے یہ اچھا موقع ہاتھ آیا۔ اس نے رقم تاوان خود ادا کرنے کا ذمہ لیا، اور اس کے معاوضے میں، کشمیر اُسکے قبضے میں دینے کی درخواست کی۔ گلاب سنگھ نے انگریزی حکومت کی جو خدمات انجام دی تھیں، اس کے صلے میں پچھتر لاکھ روپے کے معاوضہ میں عہد نامہ امرتسر کی رو سے کشمیر اس کے حوالے کر دیا گیا، اور ۱۸۴۶ء سے کشمیر ڈوگرا تسلط کے تحت آ گیا۔

کشمیر میں سکھوں کا دور، جیسا بدنام اور حوصلہ فرسا (تباہ کن) رہا تھا، اس کا کچھ حال اس عہد کے شاعر، حمید اللہ شاہ آبادی نے بھی اپنے "بہوج نامہ" میں لکھا ہے۔ جسکی تفصیل یہاں جانا یہاں باعث طوالت ہوگا۔

سکھ دور کے حکمرانوں کی تفصیل:

نمبر شمار	نام	مدت	ایام
۱	مہاراجہ رنجیب سنگھ شیر پنجاب	۱۸۱۹ء سے ۱۸۹۳ تک	۲۰ سال
۲	مہاراجہ کھڑک سنگھ	۱۸۳۹ء سے ۱۸۴۰ء	ایک سال
۳	رانی چندر کور بہ اجلاس کونسل	۱۸۴۰ء ۱۸۴۱ء تک	۳ ماہ۔ ۱۳ یوم
۴	شیر سنگھ	۱۸۴۰ء سے ۱۸۶۲ء	۲ سال۔ ۷ ماہ
۵	مہاراجہ دلیپ سنگھ	۱۸۴۲ء سے ۱۸۴۶ء تک	ڈھائی سال

ڈوگرا عہد

۱۲۶۲ھ سے ۱۳۶۵ھ تک

معاہدہ امرتسر کے طے پانے کے بعد مہاراجہ گلاب سنگھ نے اپنے وزیروں لکھپت اور پنوں کو فوج دے کر کشمیر پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجا۔ اس وقت شیخ امام الدین سکھوں کی طرف سے کشمیر کا ناظم تھا۔ سکھ حکومت کے سربراہ، لال سنگھ نے امام الدین کو خفیہ طور پر چٹھی بھیجی کہ وہ گلاب سنگھ کو کشمیر کا قبضہ نہ دے۔ چنانچہ کشمیری فوج نے امام الدین کی سرکردگی میں ڈوگرا فوج کا مقابلہ کیا، جب کامیابی کی صورت نظر نہ آئی تو گلاب سنگھ نے انگریزوں سے مدد طلب کی۔ آخر انگریزوں کی مداخلت سے گلاب سنگھ کا قبضہ کشمیر پر ہو گیا۔ اور اس نے بیربل در کے بیٹے راج کاک در کو ناظم مقرر کیا۔

گلاب سنگھ نے کشمیر میں امن کی بحالی کی کوشش کی اور پنڈت راج کاک در ناظم کشمیر کے ناروا سلوک اور مظالم کی وجہ سے بافی (شالباف)، جو کشمیر سے ہجرت کر جانے کی تیاری کر رہے تھے، گلاب سنگھ نے انہیں روکا اور ان کی شکایتوں کو دور کرنے کا حکم دیا۔ گلاب سنگھ اب پہاڑی علاقے کا سب سے زیادہ طاقت ور راجہ ہو گیا تھا۔ اس نے اسکردو، لداخ، کشتوار اور ضلع جہلم کو سلطنت کے حدود میں شامل کر کے اسے وسعت دے دی۔

مہاراجہ گلاب سنگھ نے ۱۸۵۲ء میں کشمیر کی حکومت اپنے بیٹے، رنبیر سنگھ کے سپرد کر دی، اور خود کشمیر میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ اس کے ایک سال بعد ۱۸۵۷ء میں ہند کی آزادی کے لیے پہلی لڑائی لڑی گئی، اس لڑائی میں رنبیر سنگھ نے اپنے باپ کے حکم کی بنا پر انگریزوں کی مدد فوج اور روپے سے کی۔ آخر آزادی چاہنے والوں کو اپنی کوششوں میں ناکامی ہوئی، اور انگریزوں کا تسلط بھارت پر مستحکم ہو گیا۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانے میں، جہاں تک درباری زبان کا تعلق ہے اگلے طویل عہد کی

روایت جاری رہی، حالانکہ جدید ہندوستانی زبانوں میں اردو، ہندوستان کے اور علاقوں کی طرح کشمیر میں پھیل رہی تھی، اور ادبی زبانوں کے طور پر رائج ہونے لگی تھی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے نظم ونسق کی اصلاح کی اور نئے عہد کے تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے، تعلیم کے نئے طریقے رائج کیے گئے، اور نئے سکول قائم ہوئے۔ ذریعہ تعلیم کی جگہ اردو نے لے لی، لیکن علمی اور ادبی زبان کی حیثیت سے فارسی ہی کا چلن رہا، مہاراجہ رنبیر سنگھ نے جو دارالترجمہ قائم کیا تھا، اس میں فارسی سے کئی ترجمے اردو اور دوسری زبانوں میں کیے گئے تھے۔ خاص طور پر فارسی اور عربی کی تعلیم کے لیے علاحدہ مدرسے بھی قائم کیے تھے۔ رنبیر سنگھ کے جانشین پرتاب سنگھ کے عہد میں اردو کو دفتری اور سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا، اس کے باوجود ادبی اعتبار سے فارسی اپنی جگہ قائم رہی۔

ریاست میں سیاسی آزادی کی جدوجہد ۱۹۲۴ء سے شروع ہوئی اس کے ایک سال بعد، سری پرتاب سنگھ کا انتقال ہوگیا، اور مہاراجہ ہری سنگھ ان کے جانشین ہوئے۔ ۱۹۴۹ء تک انہوں نے حکومت کی، لیکن اس سارے دور میں ذمہ دار حکومت کے لیے جدوجہد جاری رہی۔ پہلے پڑھے لکھے نوجوان نے ینگ منز مسلم ایسوسی ایشن کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، پھر کسی قدر وسیع پیمانہ پر مسلم کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا، جس کے کام کو ریاست کے سارے حصوں میں پھیلانے اور سارے نقطہ خیال کے لوگوں کو اس میں شامل کرنے کے مقصد سے اس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کردیا گیا۔ اس جدوجہد میں عوامی قائدین، غلام حیدر شاہ، قاضی گوہر رحمٰن، اللہ رکھا ساغرؔ، غلام احمد اشائی، اور دوسرے کئی اصحاب، منظر عام پر آئے اور ان سے قریب تر زمانے میں شیخ محمد عبداللہ، مرزا افضل بیگ، بخشی غلام محمد، خواجہ غلام محمد صادق، چودھری غلام عباس، مولانا محمد سعید نے قیادت کا کام اپنے ذمہ لے لیا۔

(ماخوذ از کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ)

ڈوگرہ شاہی دور کے علماء (۱۲۶۳ھ سے ۱۳۶۵ھ تک):

نام عالم/سادات	سنہ وفات	نام عالم/سادات	سنہ وفات
خواجہ عبدالاحد نقشبندی	۱۲۶۷ھ	میر عبدالاحد اندرابی	۱۳۰۵ھ
میر جمال الدین اندرابی	۱۲۷۱ھ	میر محی الدین	۱۳۰۶ھ
میر لطیف اللہ قادری	۱۲۷۰ھ	شاہ یوسف ثانی	۱۳۰۶ھ
خواجہ غلام رسول نقشبندی	۱۲۷۰ھ	ژاہ عبدالغنی بقائی	۱۳۰۹ھ
میر مبارک شاہ	۱۲۸۰ھ	میر ولی اللہ اندرابی	۱۳۱۰ھ
میر نظام الدین	۱۲۸۰ھ	سید شاہ محمد سندی	
میر سعید اندرابی	۱۲۸۲ھ	میر عبدالقادر اندرابی	۱۳۱۰ھ
میر احمد اندرابی	۱۲۸۴ھ	میر شمس الدین	۱۳۱۳ھ
میر احمد قادری	۱۲۸۴ھ	سید صدر الدین	۱۳۱۷ھ
میر نظام الدین اندرابی	۱۲۸۸ھ	میر یوسف شاہ	۱۳۱۸ھ
خواجہ عبدالرحمن ثانی	۱۲۸۹ھ	سید باقر	۱۳۱۸ھ
میر شمس الدین	۱۲۹۱ھ	خواجہ غلام الدین نقشبندی	۱۳۱۹ھ
میر ثناءاللہ کریری	۱۲۹۳ھ	سید میر جان کابلی	۱۳۱۹ھ
خواجہ عبدالغفور نقشبندی	۱۲۹۳ھ	خواجہ عبدالعزیز نقشبندی	۱۳۲۰ھ
عبدالغنی رتنپوری		علامہ انور شاہ کشمیری	
خواجہ محمد خلیل		مولانا عبدالولی شاہ نارانتھلی (بارہمولہ)	
سید رسول شاہ	۱۲۹۶ھ		
سید سیف الدین			
میر بزرگ شاہ	۱۲۹۸ھ		
میر سیف الدین تارہ بلی	۱۲۹۰ھ		
میر محمد شاہ	۱۲۹۲ھ		
میر صدر الدین کانٹھ	۱۳۰۰ھ		
میر حسین قادری	۱۳۰۰ھ		

ڈوگرا عہد ۱۸۴۶ء سے ۱۹۴۷ء تک

نمبر شمار	نام حکمران	مدت حکمرانی
۱	مہاراجہ گلاب سنگھ	۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۶ء تک
۲	مہاراجہ رنبیر سنگھ	۱۸۵۶ء سے ۱۸۸۵ء تک
۳	مہاراجہ پرتاب سنگھ	۱۸۸۵ء سے ۱۹۲۵ء تک
۴	مہاراجہ ہری سنگھ	۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۹ء تک
۵	ڈاکٹر کرن سنگھ	۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۲ء تک (قائم مقام)
۶	ڈاکٹر کرن سنگھ	۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۵ء تک صدر ریاست
۷	ڈاکٹر کرن سنگھ	۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۷ء تک گورنر

ڈوگرہ عہد پر ایک تبصرہ:

تحریک حریت کشمیر کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان حالات پر ایک سرسری نظر دوڑائی جائے جو عملاً ڈوگرہ عہد میں یہاں پائے جاتے تھے۔ ریاست کی پچاسی فی صد آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی اور بقیہ پندرہ فی صد آبادی ہندوؤں اور سکھوں پر مشتمل تھی۔ ریاست کا حکمران ایک ہندو تھا ۔وہ اگر چہ ریاست کا ہی ایک باشندہ تھا لیکن جس مخصوص معاہدہ یا بیعنامہ کے تحت اس نے کشمیر کو حاصل کیا تھا اسکی وجہ سے وہ پوری ریاست کو اپنی ملکیت اور جاگیر سمجھتا تھا۔ اور سب سے پہلے وہ اس رقم کو بٹورنا چاہتا تھا۔ جو اس نے کشمیر حاصل کرنے کے لیے انگریزوں کو انتقال ملکیت کے عوض دی تھی۔ کشمیر پر قبضہ جمانے کے بعد صرف چند برسوں میں قرض کے بیس لاکھ روپے کشمیریوں سے وصول کر لیے جو بیعنامہ کے وقت اس نے ایک پڑوسی راجہ سے بطور قرضہ حاصل کیے تھے۔ کشمیر میں اس وقت جو شالبافی کی تجارت ہوتی تھی اس کو زبردست دھکا لگا۔ نتیجے کے طور پر شالباف بغاوت پر

اتر آئے اور ۱۸۴۷ء میں شالبافوں نے پہلی صنعتی ہڑتال کی اور پنڈت راج کاک در کے مظالم کے خلاف احتجاج کیا۔ اپنے کاروبار کو بند کر کے مہاراجہ گلاب سنگھ سے پنجاب ہجرت کرنے کی اجازت مانگی۔ لیکن مہاراجہ نے عوامی غیض وغضب کو دیکھتے ہوئے شکایات کی تلافی کا حکم دے کر موقعہ شناشی کا ثبوت دے دیا۔ شکایات سننے کا ایک عجیب وغریب ضابطہ مہاراجہ گلاب سنگھ نے یہ بنایا تھا کہ جو شخص شکایت لے کر جاتا اس کے لیے لازم تھا کہ ایک روپے کا نذرانہ پیش کر کے "عرض ہے مہاراج" کہہ کر شکایت سنائے۔۔ مہاراجہ بھی عقاب کی طرح لپک کر یہ رقم اپنی جیب میں ڈال کر صبر وتحمل سے عرضی سنتا اور دادرسی بھی کرتا۔

مہاراجہ پرتاب سنگھ کے دور میں ڈوگروں اور راج پوتوں کے بغیر کوئی بھی مسلمان ہتھیار نہیں رکھ سکتا تھا۔ اگر کسی مسلمان کے گھرانے سے کوئی ہتھیار برآمد ہوتا تو اس پر قہر بپا ہو جاتا۔ مسلمانوں کو ملازمت میں لینے سے احتراز کیا جاتا تھا۔ لگان کی جبری وصولی سے ہاہا کار مچی۔ جب کسانوں کی حالت بد سے بدتر ہوگئی تو زرعی اصلاحات کی طرف توجہ کی گئی۔ اس کام کی انجام دہی کے لیے نامور انگریز مورخ سر والٹر لارنس کشمیر لائے گئے۔ جنہوں نے تمام وادی کا دورہ کیا اور یہ تاریخی کارنامہ انجام دیا سر لارنس نے اس کام کے علاوہ کشمیر کے متعلق ایک کتاب انگریزی زبان میں "ویلی آف کشمیر" کے نام سے لکھی۔ ان زرعی اصلاحات سے اگر چہ کاشتکاروں کو مالکانہ حقوق نہیں ملے پھر بھی کاشت کے موروثی حقوق ان کو ملے یعنی ملکیت کاشت۔ اس کے پیچھے یہ فلسفہ کام کرتا تھا کہ کشمیر اس کے دادا کا خریدا ہوا ملک ہے۔ اور یہ شاہی خاندان کی ملکیت ہے۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے اپنے دورِ حکومت میں یہ قانون بنایا کہ جو لوگ ۱۸۸۵ء سے اس ریاست میں آباد ہیں انہیں ہی ملازمت میں ترجیح دی جائے گی اور اس کو سٹیٹ سبجیکٹ کا نام دیا گیا۔ چودہ برس سے کم عمر لڑکی اور اٹھارہ برس سے کم عمر لڑکے کی شادی ممنوع قرار دی گئی خلاف کرنے والے کو ایک سال کی قید ایک ہزار جرمانہ یا دونوں قسم کی سزائیں دی جاسکتی تھیں۔ رنبیر سنگھ کے دورِ حکومت میں جب ۱۸۶۵ء میں سرینگر میں ریشم خانہ کے مزدوروں نے نا انصافی کے خلاف احتجاج کیا تو فوج نے ان کا گھیراؤ کیا۔ اس کے بعد ان پر اچانک حملہ بول دیا گیا۔ بندوق کے بھٹوں سے ان کی پٹائی کی گئی اور جب مزدور پل پر جمع ہوگئے تو پل ٹوٹ

گیا۔ بہت سے مزدور دریا میں ڈوب گئے اور ۲۸ مزدور اپنے جان کھو بیٹھے۔ تین سو گرفتار کر کے رام نگر جیل جموں روانہ کیے گئے جن کا ٹارچر کیا گیا اس عہد میں سب سے زیادہ مظلوم یہاں کا کسان تھا وہ سال بھر محنت کرتا تھا اور جب فصل کٹائی کا موسم آتا تھا تو جاگیردار اور چک دار اس سال بھر کی محنت پر جھپٹ کر اس کو ناکامی پر مجبور کرتے۔ یہ ایک ناسور تھا جس کی جڑ کاٹنے کے لیے شیخ عبداللہ نے زمینی اصلاحات کا بیڑا اٹھایا۔ جب صدیوں کی غلامی کے بعد عوام کو آئین ساز اسمبلی بنانے کی اجازت ملی تو ازسرنو زرعی اصلاحات قانون بنایا گیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ کسی بھی فرد کو ایک سو بیاسی کنال سے زائد زمین اپنی ملکیت میں رکھنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس وقت ۳۹۶ بڑی جاگیریں بڑے بڑے جاگیر داروں کے قبضے میں تھیں جن کی تعداد نو ہزار تھی اور ان کے قبضے میں چار لاکھ ایکڑ زمین کی ملکیت تھی جو تقریباً اڑتیس لاکھ کنال زمین بنتی تھی ایسا کر کے ڈھائی لاکھ کاشتکار زمین کے مالکانہ حقوق حاصل کر پائے۔ شیخ عبداللہ کی وزارت نے یہ قانون منظور کیا۔ البتہ باغات کو اس قانون سے مستثنیٰ رکھا گیا۔ زرعی زمین پر جو مالکانہ حقوق جاگیرداروں کو حاصل تھے اس کا پس منظر یہ تھا کہ جب ۱۸۴۶ء میں بیع نامہ امرت سر کے تحت انگریزوں نے کشمیر کو مہاراجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کیا تو اس وقت کی ساری زرعی اراضی بھی مہاراجہ کی ملکیت قرار دے دی گئی تب سے وادی کی ساری زرعی زمین پر بدلتے ہوئے حکمران کی ملکیت قرار دی جاتی رہی یعنی جو مہاراجہ تخت نشین ہوتا تھا وہ اس کا مالک بن بیٹھتا تھا بعد میں یہی مہاراجے اپنے جابرانہ نظام کو چالو رکھنے کے لیے یہ زمین اپنے رشتہ داروں مصاحبوں اور منظور نظر لوگوں کو بڑی بڑی جاگیروں اور چکوں کی شکل میں عطا کرتے۔ جن کا مالیہ وغیرہ تو کاشتکار کو ادا کرنا پڑتا اور اس سب کے باوجود اس کو کمائی کا چوتھا حصہ ملتا۔ جس کے متعلق علامہ اقبال نے فرمایا تھا

از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقانان خراب
انقلاب، انقلاب، انقلاب اے انقلاب

ترجمہ: زمین کے اوپر مالکانہ حقوق رکھنے والوں کے ظلم کی وجہ سے کاشتکار اور ان کی کھیتیں بری حالت میں ہیں اے انقلاب اب تو ہی آ، تو ہی آ، تو ہی آ اور تو ہی آ، تاکہ خدا کے بندوں کو اس مصیبت سے نجات مل جائے۔

جاگیرداروں کے پاس اتنی مقدار میں زمین ہوا کرتی تھی کہ خود جاگیرداروں کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اُن کی زمینیں کہاں واقع ہیں اور کن اطراف میں پھیلی ہیں۔ جب فصلیں پک جاتیں تو یہ جاگیردار اپنے کارداراس غریب کاشتکار پر بلائے ناگہانی کی طرح بھیجتے اور کاشتکار سے تین چوتھائی پیداوار وصول کر کے کوٹھار (گودام) میں ڈال کر اس پر اپنا تالا چڑھا دیتے۔ اتنا ظلم تھا کہ اگر کاشتکار کے کسی چھوٹے بچے کا دل مچلتا کہ وہ اپنی بھوک بجھانے کے لیے مکی کا ایک بھٹہ کھیت سے نکال لے تو کاردار اس پر غضب کی نظر ڈالتا تھا اور اس سے مار مار کرادھموا کرتا تھا۔ اس کے منہ سے چبائے ہوئے دانے بھی اگلوا کے دم لیتا۔ کاشتکار کو مشکل سے تین چار ماہ کی روٹی ملتی تھی۔ باقی کے لیے وہ جاگیردار کے دروازے پر دم ہلاتا رہتا۔ یا پنجاب کی طرف رُخ کرتا جہاں اسی فاقہ گی کو بجھانے کی تلاش مین مرجاتا، ایسے کئی لوگ لاہور، امرتسر یاراولپنڈی کے گلی کوچوں میں دم توڑ بیٹھتے تھے۔ شام کے وقت بھیک مانگتے پھرتے اور جب ان سے پوچھا جاتا کہ تم یہ بھیک کیوں مانگتے ہو تو جواب دیتے کہ وہ مزدوری کا پیسہ مالیہ ادا کرنے کے لیے بچا کر رکھتے ہیں۔ پنجاب کے لوگ ان بیچاروں کی حالت زار پر رحم کھانے کے بجائے ان کو حقارت کے ساتھ ''ہاتو'' کہہ کر پکارتے۔ اور وہ ان لوگوں کو بوجھ اٹھانے والے جانوروں سے زیادہ مرتبہ نہ دیتے تھے۔ علامہ اقبالؒ نے کشمیریوں کی اسی صورت حال کے پیش نظر یہ شعر کہا ہے کہ

بہ ریشم قبا خواجہ از محنت او
نصیب تنش جامۂ تار تارے

(ترجمہ) اس بے کس کشمیری کی محنت کی وجہ سے جاگیردار اور چک دار اپنے بدن کو ریشمی قبا سے مزین کے ہوئے ہے لیکن اس محنت کش کے بدن کو سوائے پھٹے پرُانے کپڑوں کے کچھ بھی نصیب نہیں ہوتا ہے ایسے حالات میں جاگیرداروں اور چک داروں کی ملکیت ختم کرنا اور ایک غریب کسان کو بلا معاوضہ زمین دینا ایک جان جوکھوں کا کام تھا۔ جب انھوں نے معاوضے کا مطالبہ کیا تو شیخ عبداللہ نے اُن سے کہا کہ یہ زمین ان کے اصل مالکوں یعنی کاشتکاروں سے ہی بنیادی طور پر چھینی گئی ہے اور جاگیروں اور چکوں کی شکل میں بانٹی گئی ہے۔ اب ان سے معاوضہ

طلب کرنا خلاف انصاف وعقل ہے۔ جن لوگوں نے ان کاشتکاروں کی محنت سے اپنے عالی شان محلات تعمیر کئے ہیں ان کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس کے اصل مالکوں سے اُن کا معاوضہ مانگیں۔ معاوضے کا اگر کوئی حقدار ہے تو وہ کاشتکار ہے جسکو سو سال سے دو دو ہاتھوں لوٹا جا رہا ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ ہم اتنے روپے کہاں سے لائیں جن سے ہم جاگیرداروں اور چک داروں کی لبالب بھری ہوئی تجوریوں میں اور اضافہ کریں۔ ہندو جاگیرداروں کے اُکسانے پر ہندوستان کے سردار پٹیل نے بھی ان اصلاحات کی مخالفت کی۔ جس کے کانوں میں یہ بات ڈالی گئی کہ یہ کاروائی مذہبی تعصب کی بنیاد پر کی جارہی ہے۔ حالانکہ اس قانون کی زد میں مسلمان جاگیردار بھی آتے تھے البتہ بقول شیخ صاحب پنڈت جواہر لال اور مولانا ابوالکلام ان اصلاحات کو پسند کرتے تھے اور ان کے حق میں تھے۔ ان اصلاحات کی وجہ سے بہر حال اتنا فائدہ ہوا کہ گذشتہ شب جو کاشتکار ایک غلام کی حیثیت سے سویا تھا اس نے صبح تڑکے اپنے آپ کو مالک زمین کی شکل میں پایا۔ اس فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے مین مرزا محمد افضل بیگ نے قابل تعریف کام کیا۔

کشمیر کی اس مظلومانہ صورت حال کو علامہ اقبالؒ نے ایک اور جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

سرما کی ہواوں میں عُریاں ہے بدن اُس کا
دیتا ہے ہنر جس کا امیروں کو دوشالہ

کشمیری کانفرنس کے نام ریاست سے ہجرت کرنے والے کچھ دردمند مسلمانوں نے جو جماعت بنائی تھی اس کے ایک اجلاس مین علامہ اقبالؒ نے یہ ولولہ انگیز قطعہ پڑھا۔

پنجۂ ظلم و جہالت نے بُرا حال کیا
بن کے مقراض ہمیں بے پر و بال کیا
توڑ اُس دست جفا کیش کو یارب
روحِ آزادی کشمیر کو جس نے پامال کردیا

حفیظ جالندھری نے کشمیر کی اسی صورت حال کے پیش نظر یہ شعر رقم کیا ہے۔

شہر سے محروم ہے مالک جوئے شیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ایک دوسری نظم میں مہاراجہ کے مظالم کو ان الفاظ میں چاک کیا ہے۔

سرخ پھولوں سے زمین کشمیر کی ہے سرخ رو
لالہ بن کے پھوٹ نکلا ہے شہیدوں کا لہو
معرکہ اس خاک پہ گزرا ہے دار و گیر کا
لالہ زار اس کو نہ سمجھو کھیت ہے شمشیر کا
حملہ آور ہیں مہاراجے کی فوجیں چار سو
شعلہ زن ہے آگ اور لوہے کی موجیں چار سو
فطرت انسان کو ہے طوق غلامی ناپسند
نعرے آزادی کے لے کر اٹھے ہیں سر بلند
سرفروشوان چراغوں سے ضیا لیتے ہوئے
آگے اور آگے بڑھو نام خدا لیتے ہوئے

ان ظلمتوں سے چھٹکارا پانے کے لیے اور کشمیریوں کی سربلندی کے لیے علامہ اقبالؒ خدا سے یوں دست بدعا تھے۔

ازاں مے فشاں قطرۂ بر کشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے

ترجمہ: اے اللہ تو اس شراب (رحمت) سے ایک قطرہ کشمیر پر برسا تا کہ اس کی راکھ کے نیچے دبی چنگاری سے شرارے شعلہ زن ہوں۔

کشمیریوں کی صحیح قیادت کے لیے انھیں ایک ایسے درویش کی تمنا تھی جس کی آہ سحری سے محکوموں کے دل معمور ہو جاتے۔

معمور ہوں دل جس کی فغانِ سحری سے
اس دیس میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب

بیعنامہ امرتسر کے متعلق انہوں نے اپنے جذبات کا اظہار ان اشعار میں کیا۔

اے بادِ صبا گر بہ جینیوا گذر کنی
حرفے زِ ما بہ مجلسِ اقوام باز گوئے
دہقان و کشت و جوئے و خیاباں فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

(ترجمہ) اے صبح کی دلکش ہوا اگر تیرا گذر جینیوا کی طرف ہو جائے [جو اان دنوں جمیعت الاقوام (League of Nations) کا ہیڈ کوارٹر تھا] تو اس مجلس اقوام کے سامنے دوبارہ ہماری چند معروضات ان الفاظ میں بیان کرنا کہ کشمیر کے کسان، ان کی کھیتیں، آبشار اور جنگل مع پوری قوم کے سب حقیر معاوضے میں بیچے گئے آہ کیسا سستا بکاؤ ہوا۔

علامہ اقبال کو یقین تھا کہ ظلم وستم کے پہاڑوں کے نیچے جس طرح یہ قوم دبائی گئی ہے۔ وقت آنے پر اس سرزمین میں آناً فاناً ایسا انقلاب آئے گا۔

باش تا بینی کہ بے آوازِ صور
ملتے برخیزد از خاکِ قبور

(ترجمہ) اے مخاطب ذرا صبر کر تو خود بخود دیکھے گا کہ بگل کی آواز بجانے کے بغیر ہی یہ پوری قوم ان قبروں سے کھڑی ہو جائے گی۔

آغا عبدالکریم خان (جو شورش کاشمیری) کے نام سے معروف ہیں اور مطالبۂ پاکستان کے زبردست حامی تھے) نے ہری سنگھ کو یوں للکارا:

اے ہری سنگھ نواہائے شرربار سے ڈر
وقت اور وقت کی بدلی ہوئی رفتار سے ڈر
بجلیاں کوندرہی ہیں سر میدانِ وفا
شیرِ کشمیر کے آوازۂ پیکار سے ڈر
اپنے محلوں کی دھڑکتی ہوئی بنیاد کو دیکھ
اپنے آغاز کے انجام سیہ کار سے ڈر

ابوالاثر حفیظ جالندھری نے بیع نامہ امرتسر پر ان اشعار سے چوٹ کی۔

لوٹ لی انسان کی قسمت پچھتر لاکھ میں
بک گئی کشمیر کی جنت پچھتر لاکھ میں
ملک وملت، قوم، مال وجان پچھتر لاکھ میں
ہاں پچھتر لاکھ میں، ہاں ہاں پچھتر لاکھ میں
شیر وادی میں دہاڑا گونج اٹھے کوہسار
ہو گئے بیدار مزدور اور جاگے کاشتکار
چار سو آزادیٔ جمہور کی سن کر پکار
ہو گئی برہم نشے میں نخوت سرمایہ دار
عیش کے کانوں میں پیغام اجل آنے لگا
کاروبار شہریاری میں خلل آنے لگا

اپنے اخبار ''زمیندار میں مولانا ظفر علی خان نے یہ اشعار رقمطراز کیے۔

ہر طرف ہنگامہ پھر برپا ہے دارو گیر کا
ہو رہا پھر ہرا زخم کہن کشمیر کا
گونجتی ہے پھر فضا زنجیر کی جھنکار کا
شور جس میں دب رہا ہے نعرۂ تکبیر کا

غلامی کے خلاف منظّم جدوجہد کا آغاز

انجمن کشمیری لاہور:

کشمیر کی آزادی کے لیے منظم جدوجہد کا آغاز انجمن کشمیری مسلمانانِ لاہور سے شروع ہوا کشمیری نسل نے کے ناطے علامہ اقبالؒ نے اس انجمن کے قیام میں نہایت ہی سرگرم اور مؤثر رول ادا کیا۔ علامہ اقبالؒ نے اسی پلیٹ فارم سے کشمیری مسلمانوں کے حقوق کے لئے جدوجہد شروع کی۔

کشمیری گزٹ:

علامہ اقبالؒ کی رہنمائی میں ایک کشمیری نثراد مسلمان منشی محمد دین فوق نے ۱۹۰۰ء میں ایک ماہانہ کشمیری گزٹ شروع کیا۔ مقصد کشمیر کی زبوں حالی کو اُجاگر کرنا تھا۔

اخبار کشمیر:

۱۹۰۴ء میں مسلم لیگ وجود میں آئی اور ایک اور میگزین شائع کیا گیا اسی کو ۱۹۱۲ء میں اخبار کشمیر کا نام دیا گیا۔ یہ رسالہ ۱۹۳۴ء تک ہفتہ وار شائع ہوتا رہا۔

آل انڈیا کشمیری کمیٹی:

انجمن کشمیری مسلمانان لاہور کو ۱۹۰۸ء میں آل انڈیا کشمیر کمیٹی کا نام دیا گیا اور علامہ اقبالؒ نے اس کمیٹی کے ذریعے کشمیر کے مسلمانوں کا کاز ہندوستانی مسلمانوں کا کاز بنایا۔ اور اس کمیٹی میں ہندوستان کے اہم مسلمان دانشوروں کو شامل کیا۔

کشمیر کمیٹی پر تبصرہ:

تحریک حریت کشمیر کے سلسلے میں ''کشمیر کمیٹی'' کا تذکرہ کرنے کے بغیر اس کی تاریخ نامکمل رہے گی ۱۹۳۱ء میں جو خونی واقعات کشمیر میں پیش آئے اس نے اگرچہ پورے ہندوستان کے

با حس عوام کو بے حد متاثر کیا لیکن پنجاب میں اس کا زیادہ ہی اثر رہا۔ مظلوم کشمیری عوام کے ساتھ اپنی ہمدردی کا اظہار کرنے کیلئے علامہ اقبال نے ''کشمیر کمیٹی'' تشکیل دی۔ اپنی مصروفیات کی وجہ سے وہ خود اس کمیٹی کے صدر نہ بنے البتہ قادیانیوں کے امام مرزا بشیر الدین محمود احمد کو اس کمیٹی کا صدر مقرر کیا علامہ اقبال اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ان کے پاس کافی وسائل تھے اور کام کرنے والے کارکن بھی تھے۔ ان باتوں کے پیش نظر علامہ اقبال کے خیال کے مطابق ان سے بہتر کوئی اور آدمی نہ تھا۔ خواجہ حسن نظامی نے علامہ اقبالؒ کی اس تجویز کی حمایت کی۔ بعد میں اس کمیٹی کو وسعت دی گئی اور بعض اہم شخصیات کو اس میں شامل کیا گیا۔ فرقہ قادیانیت کا بانی پنجاب کا غلام احمد قادیانی تھا۔ اس کا باپ انگریزی گورنمنٹ کا ایک ملازم تھا۔ مرزا غلام احمد ۱۸۳۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۰۸ء میں اس دنیا سے چل بسا۔ پہلے ایک صحیح عقیدہ رکھنے والا مسلمان ہی تھا اور اسلام کے دفاع کے سلسلے میں عیسائیوں اور آریوں سے مناظرے بھی کرتا تھا لیکن جب اس کی مقبولیت بڑھی تو نبوت کا دعویٰ کیا۔ اس نے چوراسی کتابیں لکھیں لیکن پاکستان بننے کے بعد حکومت نے اس کو اور اس کے ماننے والوں کو غیر مسلم قرار دیا۔ چونکہ اس کا قلم آسان اردو زبان میں بہت تیز چلتا تھا اور خاندانی اعتبار سے اس کا باپ اور یہ شخص بذات خود انگریز حکومت کا بڑا وفادار تھا اور اس کے خلاف جہاد کا مخالف تھا۔ لہٰذا انگریز بھی ان کے ساتھ بڑی فراخ دلی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ کیونکہ انہیں مذہب سے زیادہ اپنے حکومتی استحکام کے ساتھ دلچسپی تھی جس کی بنیاد پر وہ ہندوستان کی دولت کو دو دو ہاتھوں لوٹ رہے تھے۔ چونکہ قادیانیت پر مذہب کی چھاپ تھی لہٰذا اپنے مذہب کو فروغ دینے کے سلسلے میں ان کے اندر ایک مشنری جذبہ بھی پایا جاتا تھا جس کی انگریز لوگ بھی پشت پناہی کر رہے تھے اور یہ شخص بھی اپنی انتہائی چالاکی کی وجہ سے انگریزوں کو اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتا تھا۔ جو برصغیر میں بھکاری تاجروں کی طرح آئے تھے اور سیاسی عیاروں کی طرح برصغیر پر قابض ہو گئے۔ جب انہیں ایک خیر خواہ شخص مذہبی روپ میں مل گیا تو انہوں نے اس طبقے کو بڑے بڑے عہدوں سے نوازا۔ لہٰذا ملک کے بہت سارے جدید تعلیم یافتہ لوگ مذہبی امور میں اپنی بے بصیرتی کی وجہ سے مرزا صاحب کے دام تزویر میں آ گئے اور اس خانہ ساز نبوت کے انتہائی پر پیچ داؤں میں پھنس گئے۔ حتیٰ کہ حضرت علامہ اقبالؒ جیسے قلندر صفت اور

صاحب ہوش مفکر بھی اس کے صحیح خدوخال کو کافی عرصہ تک سمجھنے سے قاصر رہے۔اور تحریک کے ابتداء میں اس کے متعلق ایک اچھی رائے رکھتے تھے۔لیکن اس کے برعکس برصغیر کے علماء کا صاحب بصیرت طبقہ ابتداء میں اس نئی ابھرنے والے مصنوعی نبوت کے عزائم سے چونک اٹھے تھے لہٰذا وہ کشمیر کمیٹی کو کشمیری مسلمانوں کے دینی عقائد پر ڈاکہ ڈالنے کا قبل از وقت اندازہ لگا چکے تھے اور وہ ہر محاذ پر قادیانیوں کے عزائم کے متعلق کڑی نگاہ رکھتے تھے۔قادیانیوں کے ساتھ کافی قربت رکھنے کی وجہ سے شیخ محمد عبداللہ صاحب پر بھی یہ راز کھل چکا تھا کہ قادیانی لوگ جو مالی وسیاسی معاونت کشمیر کی تحریک حریت کو کر رہے ہیں اس کے پیچھے ان کے مذہبی اغراض کام کر رہے ہیں۔قادیانیوں کے انہی عزائم کے پیش نظر ایک دفعہ مجلس احرار کا ایک تین رکنی وفد سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، چودھری فضل حق اور مولانا داؤد غزنوی علامہ اقبال کے پاس گئے اور ان سے کہا:

''کیا آپ نے بھی قادیانی قیادت قبول کر لی ہے۔اگر آپ کی دیکھا دیکھی کشمیر کے بتیس لاکھ مسلمان قادیانی ہو گئے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ مجرم ہونگے، نیز قادیانی دوسرے اسلامی مسلمانوں پر بھی گمراہ کن اثر کریں گے لہٰذا آپ ان سے علحدگی کا اعلان کریں۔''

چنانچہ اسی وقت فیصلہ ہوا کہ اگلے روز کشمیر کمیٹی کا اجلاس بلایا جائے گا اور مرزا بشیر الدین محمود کو اس کی سربراہی سے علحدہ کیا جائے گا۔دوسرے روز لاہور کے برکت علی حال میں کشمیر کمیٹی کا اجلاس بلایا گیا جس میں مجلس احرار کے چند ذمہ دار بغیر دعوت کے شریک ہوئے۔ڈاکٹر علامہ اقبال نے میٹنگ کے شروع ہوتے ہی مرزا بشیر الدین محمود کو کشمیر کمیٹی سے الگ کر کے اس کی صدارت خود سنبھالی اور فرمایا:

''قادیانی اپنے مذہبی پیشوا کے علاوہ کسی شخص یا جماعت کی وفاداری نہیں کر سکتے۔اس کی وجہ سے کام کرنے میں رکاوٹ آتی ہے۔''

۱۴ اگست ۱۹۳۱ء کو علامہ اقبال اس کمیٹی کی صدارت سے بھی علحدہ ہو گئے۔کیونکہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ ان سے ناراض ہو گئے اور یہ ناراضگی کا واقعہ اس وقت سامنے کھل کر آ گیا جب علامہ انور شاہؒ صاحب لاہور پہنچے تو علامہ اقبال کو ان کی تشریف آوری کی اطلاع ملی۔علامہ اقبال نے علامہ انور شاہ صاحب کو اپنے ہاں کھانے پر مدعو کیا لیکن علامہ نے یہ کہہ کر دعوت رد کر دی کہ:

'آپ نے مرزائیوں کی خود ساختہ کمیٹی کی صدارت قبول کر کے اپنا اسلامی عقیدہ مشکوک کر لیا

ہے۔لہٰذا آپ جب تک اسے درست نہیں کرتے ہیں آپ کے ہاں کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

اس پر ڈاکٹر اقبالؒ کشمیر کمیٹی کی صدارت سے علحدہ ہو گئے اور دو سال کے بعد ایک موقع پر فرمایا:

"میرے دل میں کشمیر کمیٹی کے متعلق اسی وقت خطرات پیدا ہو گئے تھے لہٰذا کشمیر کمیٹی جو ایک مخصوص مذہبی فرقہ کی جماعت ہے اس جماعت سے میرا واسطہ درست نہیں۔"

علامہ اقبال جون ۱۹۳۳ء تک کشمیر کمیٹی کو چلاتے رہے۔اس کمیٹی سے مستعفی ہونے کے بعد بھی وہ کشمیریوں کے مسائل کے حل کے لیے کام کرتے رہے۔چنانچہ ۲/جولائی ۱۹۳۳ء کو انہوں نے لاہور میں ایک پبلک جلسہ کا انعقاد کیا اور اس اجتماع میں تحریک کشمیر کی مکمل حمایت کا اعلان کیا۔

مرزائیوں نے اپنے ایک الگ اجلاس میں یہ تجویز پیش کی کہ صدارت اور سکریٹری شپ علامہ اقبالؒ اور خان بہادر حاجی عبدالرحیم بخش کو دی جائے لیکن اسکا فیصلہ ہونے تک مرزا بشیر الدین محمود اور چودھری غلام مصطفیٰ بیرسٹر گجرانوالہ پر مشتمل ایک سب کمیٹی مقرر کر دی جائے لیکن علامہ اقبال اور رحیم بخش صاحب نے اس پرانی کشمیر کمیٹی میں شریک ہونے سے صاف انکار کیا۔مگر مرزائیوں نے آل انڈیا کشمیر کمیٹی کا اجلاس ۲۵/مارچ ۱۹۳۴ء لاہور میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تا کہ ممبران سے رائے طلب کی جائے کہ کشمیر کمیٹی اس وقت تک جن اصولوں پر کام کرتی رہی ہے انہی اصولوں پر دوبارہ کام کرنا ان کے لیے مفید ہوگا یا نہیں؟

اپنی مخصوص سوچ کی بنیاد پر شیخ صاحب کشمیر کمیٹی کے قائم رہنے کو اور کام کرنے کو ضروری سمجھتے تھے لہٰذا کشمیر کمیٹی کے نام اپنے ایک خط میں انہوں نے لکھا کہ:

"میری ناقص رائے میں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کام برابر جاری رکھا جائے اور جو کمیٹی پہلے بنی تھی وہ برابر کام کرے۔یہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ اس کی ہر سیاسی جماعت کی خودغرضی باہمی اتفاق کو نقصان پہنچا کر ساری قوم کو نقصان پہنچانے کے لیے اور نیز اس انجمن کو ختم کر دینے کے لیے اسباب پیدا کر دیتی ہے۔آل انڈیا کشمیر کمیٹی کو ضرور کام کرنا چاہیے آپ کی سربراہی میں بابت انتخاب عہدیداران میری رائے میں مسٹر غلام رسول مہر کو سکریٹری مقرر کیا جائے اور صدارت کے

لیے مہر صاحب کی جو رائے ہوگی وہی میری رائے سمجھی جائے۔ مجھے افسوس ہے میرے مشاغل مانع ہیں کہ جلسہ میں شرکت کرسکوں۔

آپکا تابعدار
شیخ محمد عبداللہ

اس خط میں شیخ صاحب نے کشمیر کمیٹی کو حسب سابق کام کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن اس سے دو طرح کے خطرات تحریک کے لیے پیدا ہوئے۔ ایک یہ کہ کشمیر کے وزیر اعظم مسٹر کالون کو موقع ملا کہ شیخ عبداللہ بیرونی عناصر کو تحریک کشمیر میں مداخلت کے لیے اکسا رہے ہیں جس کے متعلق وزیر اعظم نے شیخ عبداللہ کو پہلے ہی یہ مشورہ دیا تھا کہ ایسا کرنے سے وہ باز رہے۔ دوسرا خطرہ یہ کہ کشمیر کے دو بڑے علامہ یعنی انور شاہ صاحبؒ اور علامہ اقبالؒ جو خطرہ مرزائیوں کی طرف سے محسوس کرتے تھے مذہبی علوم میں گہری بصیرت نہ ہونے کی وجہ سے شیخ صاحب کی نگاہ وہاں تک نہ جاتی تھی کیونکہ علامہ اقبالؒ کا نظریہ یہ تھا کہ

دین ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت
تو ایسی تجارت میں ہے مسلمان کا خسارا

البتہ یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ شیخ عبداللہ علامہ اقبالؒ کو بھی ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے جن کا انفرادی وجود بھی ایک تحریک کے اثر ورسوخ کے برابر تھا۔

ہر نئی ابھرنے والی تحریک کے اندر جو ابتدائی جوش وخروش ہوتا ہے اس سے تحریک کو ضرور حوصلہ اور فروغ ملتا ہے یہی مثال قادیانیت پر بھی فٹ آسکتی ہے لیکن بقول علامہ اقبالؒ:

''مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ ربع صدی قبل مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی۔ لیکن کسی تحریک کے اصل مضمرات اور اسکی حقیقی روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی۔ اس کے لیے برسوں چاہیں، تحریک کے دو گروہوں کے باہمی نزاعات اس امر پر شاہد ہیں کہ خود ان لوگوں کو جو بانی تحریک سے ذاتی روابط رکھتے تھے معلوم نہ تھا کہ تحریک آگے چل کر کیا رنگ اختیار کرتی ہے میں ذاتی طور پر اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا جب ایک نئی نبوت سے متعلق بانی اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت کا دعویٰ کیا گیا۔ اس کے بعد میرے شکوک وشبہات بیزاری سے بغاوت کی حد تک پہنچ گئے

۔ جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آنحضرت ﷺ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے ہوئے سنا۔ درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر میرے موجودہ رویہ میں کوئی تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ سوچنے والے انسان ہی کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے کو بدل سکے۔ بقول ایمرسن ''صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے''۔

اسی طرح شیخ صاحب کے محبوب دوست پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک دفعہ لندن سے واپسی پر ایک انٹرویو میں کہا کہ ''مرزائی برطانوی گماشتہ (Agent) ہیں''۔

نہ معلوم شیخ صاحب کو قادیانیوں کے اتنے سخت عزائم کا صحیح علم تھا یا نہیں لیکن ہم شیخ صاحب کے ہم عصر اور کشمیر کے دو صحیح العقیدہ علاموں کی رائے اور بصیرت کو نظر انداز نہیں کر سکتے ہیں جن کی عظمت کا قائل پورا عالم ہے کیا صرف جسمانی آزادی کے لیے ایمانی عقائد کو قربان کیا جاسکتا ہے یا آزادی کے سلسلے میں صرف مالی یا اخلاقی تعاون کی بنیاد پر عقائد کے انہدام کا سودا کیا جاسکتا ہے۔ نہ معلوم ایسے مشاہیر علاموں کے مخلصانہ مشوروں کے مقابلے شیخ صاحب صرف اپنے ذاتی افکار پر کیوں ڈٹے رہے جب کہ وہ خود بھی قادیانیوں کے ان منصوبوں کا اپنی کتاب آتش چنار میں تصدیق کرتے ہیں۔

شبنم قیوم صاحب نے اپنی کتاب مفصل تاریخ وتحریک کشمیر کے جلد دوم میں ان تمام خطوط کو یکجا کیا ہے جو شیخ صاحب اور قادیانی ذمہ داروں کے درمیان خط وکتابت کی شکل میں ہوئے ہیں۔ ان تمام خطوط پر غیر جانب دارانہ طریقے سے غور کرنے سے قاری کے اس شک میں ضرور تقویت ملتی ہے کہ اس طرز عمل سے کشمیر میں مرزائیت کے لیے راہ ہموار ہو رہی تھی جو کسی طرح بھی اسلام کے ابدی اور ازلی اصولوں کے مطابق مسلمانون کے لیے کوئی نیک شگون نہیں تھا اور اگر کچھ لوگ وقتی مصلحتوں کو قربان کر کے آڑے نہ آتے تو آج کشمیر مرزائیت کا ایک مضبوط قلعہ ہوتا۔

شیخ صاحب آتش چنار کے صفحہ ۱۴۵ پر لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے احمدیوں کی اس روش پر تبادلہ خیال کرنے کے لیے ایک میٹنگ طلب کی جس میں مرزا محمود احمد نے بھی شرکت کی۔ اس میں شیخ صاحب نے ان سے کہا کہ کچھ عرصے سے قادیانی عقیدے کے دوستوں نے اس پلیٹ فارم سے اپنے مسلک کی تبلیغ شروع کر دی ہے اگر اس پر روک نہ لگائی گئی تو نتائج بہت تباہ کن

ہوں گے۔ مرزا صاحب نے میری تقریر صبر وسکون کے ساتھ سنی اور پھر بولے کہ احمدی جماعت بنیادی طور پر ایک تبلیغی جماعت ہے ہم نے پہلے پہل کشمیر میں اس قسم کی سرگرمیوں پر روک لگا رکھی تھی لیکن وہ ایک عارضی مرحلہ تھا ہمارے لیے مستقل طور پر اس پر پابندی کرنا اور اپنے مشن سے دست بردار ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس پر میں نے دوٹوک جواب دیا کہ ایسے حالات میں احمدی جماعت کے ہم خیال کارکنوں کا تحریک سے وابستہ رہنا نہ مناسب ہے اور نہ ممکن۔ کیونکہ ان کا تحریک کا جزو بن کر تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف رہنا کانفرنس میں فرقہ واریت کے شعلے بھڑکا سکتا ہے جن میں ہمارا ساحل خاکستر ہو کر رہ جائے گا۔ اس دن کے بعد ہی سے احمدی جماعت کا رویہ تحریک کے ساتھ پہلے پہل تو سرد مہری کا رہا۔ بعد میں وہ ہماری مخالفت کرتے رہے۔ اور آخر کار کھلم کھلا ہمارے خلاف صف آرا ہو گئے۔ ہماری تحریک سے مولوی عبداللہ، خواجہ غلام نبی گلکار اور دوسرے کچھ اہم ساتھیوں کی علحدگی کی بنیادی وجہ یہی تھی۔ دوسرا واقعہ شیخ صاحب یوں بیان کرتے ہیں کہ ''ایک بار ہمیں جماعت احمدیہ نے کسی تقریب کے سلسلے میں بڑے اصرار سے قادیان بلایا۔ ان دنوں زین العابدین صاحب ان کے امور خارجہ کے نگران تھے ہم ان کے مہمان تھے۔ ایک بار باتوں باتوں میں انہوں نے کہا کہ غیر احمدی تو احمدی امام کے پیچھے نماز ادا کر سکتے ہیں لیکن احمدیوں کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی غیر احمدی کے پیچھے نماز پڑھیں۔ میں نے جب وجہ جاننا چاہی تو وہ کچھ رازداری کے سے لہجے میں بولے کہ احمدی مرزا غلام احمد صاحب کو بھی نبی مانتے ہیں اور جو ان پر ایمان نہ لائے اس سے خارج از اسلام سمجھتے ہیں۔ ان حالات میں کیسے غیر احمدی کے مقتدی بن سکتے ہیں؟ ان کی اس صاف گوئی سے میری آنکھوں پر سے پردہ سا ہٹ گیا اور ان کی نیت اور حکمت عملی کا سارا راز فاش ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ ہمارے درمیان راستوں کی علحدگی ٹالی نہیں جا سکتی تھی۔ (دیکھو آتش چنار صفحہ نمبر ۱۴۶، ۱۴۷)

کشمیر کمیٹی کی ترغیب پر ۱۹۰۹ء میں ینگ منز ایسوسی ایشن کا قیام:

علامہ اقبالؒ نے جس کشمیر کمیٹی کا قیام عمل میں لایا تھا۔ اسی انجمن نے جموں کے نوجوانوں کو تحریک دی کہ وہ ینگ منز ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں لائیں۔ یہی بعد میں جموں کے مسلمانوں کی تنظیم بنی اور چودھری غلام عباس خان نے ۱۹۲۲ء میں اسی تنظیم کا احیاء کیا اگرچہ اس کی بنیاد ۱۹۰۹ء میں ڈالی گئی تھی۔ اسی انجمن کے پلیٹ فارم سے چودھری غلام عباس نے ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۹ء تک رہا

ستی مسلمانوں کے مظالم کے خلاف آواز بلند کی۔

۱۹۲۴ء میں سرینگر میں ریشم خانہ کے مزدوروں کا احتجاج:

مہاراجہ پرتاب سنگھ کے زمانہ میں ریشم خانہ کے مزدوروں نے ظلم و جبر کے خلاف احتجاج کیا۔ کشمیر میں ڈوگرہ شاہی کے خلاف یہ پہلا احتجاج تھا اس میں بہت سے مزدور زخمی ہو گئے۔ ایک پنجابی مسلمان چودھری نیاز احمد کو تحقیقات کے لیے جج مقرر کیا گیا جس کو بہت طول دیا گیا۔ مزدور عاجز آ گئے۔ کوئی اور ذریعہ معاش نہ ہونے اور بھوک کی وجہ سے عاجز ہو کر کام پر واپس لوٹ آئے مگر مزدور لیڈروں کو چھ ماہ کی قید سخت سنائی گئی۔

۱۹۲۴ء میں وائسرائے کی آمد پر مظاہرہ:

ایک دفعہ جب ہندوستان کے برطانوی وائسرائے لارڈ ریڈنگ اپنی بیگم کے ساتھ کشمیر کے دورے پر آئے۔ مسلمانوں میں ڈوگرہ راج کے خلاف زبردست ناراضگی تھی۔ چونکہ مہاراجہ کے اصل آقا انگریز ہی تھے لہٰذا مسلمانوں کو یہ سوجھا کہ اپنی فریاد وائسرائے تک پہنچا دیں شاید وہ مہاراجہ کو عدل و انصاف کی طرف راغب کرے۔ ایک یاداشت مرتب کی گئی جس پر شہر کے معزز حضرات نے اپنے دستخط کیے۔ جب وائسرائے دریائی جلوس کی شکل میں گزر رہے تھے تو کنا روں پر مسلمانوں نے سیاہ جھنڈیاں دکھا کر ''فریاد فریاد'' کی صدا بلند کی۔ یاداشت میں سترہ نکات تھے۔ وائسرائے نے یہ عرضی مہاراجہ کے پاس بھیج دی۔ اس یاداشت کا اہم نکتہ یہ تھا کہ کسا نوں کو زمین کی حق ملکیت دی جائے۔ تحقیقات کے لیے مہاراجہ نے تین آفیسروں کی ایک کمیٹی مقرر کی۔ جو ایک ڈھونگ تھا پھر عرضی کو داخل دفتر کیا گیا۔ اور دستخط کرنے والوں میں سعد الدین شال کو گرفتار کر کے جلا وطن کیا گیا اور ایک تحصیل دار نور شاہ کو نوکری سے ہٹایا گیا۔ اور اسکی جاگیر بھی ضبط کی گئی۔ میر واعظ کو درباریوں کی فہرست سے خارج کیا گیا۔ آغا سید جلالی کو زیلداری کے منصب سے ہٹایا گیا۔

بنر جی کی بغاوت:

مہاراجہ نے ۱۹۲۹ء میں بنگال سے ایک بنگالی برہمو جو ایک اعلیٰ ذات کا ہندو تھا اور حکومت ہند کے ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا بلا کر اپنے انتظامی کونسل کا وزیر اعظم اور وزیر خارجہ بنایا۔ اس کا نام سر بنر جی تھا۔ وہ کچھ اصلاحات چاہتا تھا کیونکہ وہ ایک جرأت مند اور راست باز آدمی تھا۔ اس نے عوام پر جاری ستم رانیوں کو کم کرنے کی وکالت کی۔ مہاراجہ کو اس کا یہ مخلصانہ مشورہ پسند نہ آیا اور اس گلا گھونٹنے کی کوشش کی۔ اس باضمیر شخص نے فوراً استعفیٰ پیش کیا واپسی پر جب وہ لاہور پہنچا تو اس نے اخباری نمائندوں کے سامنے کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کی پوری داستان بیان کی جس سے حکومت کے ایوانوں میں زلزلہ آیا۔

شیخ عبداللہ نمودار ہو گئے:

سر بنر جی کے اظہار حق سے جو خفت مہاراجہ کو اٹھانی پڑی تھی اس کا ازالہ کرنے کے لیے مہاراجہ نے اپنے کچھ ہندو اور مسلمان قصیدہ خوانوں کا سہارا لیا اور سر بنر جی کے بیان کی تردید میں مضحکہ خیز کوشش کی۔ ان دنوں شیخ محمد عبد اللہ علی گڈھ میں زیر تعلیم تھے۔ انہوں نے اس تردیدی بیان کے خلاف لاہور کے ایک اخبار "مسلم آوٹ لک" میں اپنا ایک خط اشاعت کے لیے بھیج دیا۔ جس میں کشمیر دربار کی اس جوابی حرکت کی سخت الفاظ میں نکتہ چینی کی۔ یہ شیخ صاحب کا سیاسی میدان میں پہلا قدم تھا۔ خط کے شائع ہونے کے بعد لاہور کی کچھ اہم شخصیتوں نے شیخ صاحب کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے کی کوشش کی۔ پھر ان کو لاہور کے ایک ہوسٹل میں ٹھہرایا جس کا خرچہ احمدیہ انجمن لاہور نے برداشت کیا۔ لاہور میں ایک شخص سید محسن شاہ صاحب ایک بہت بڑے وکیل تھے جو کشمیری کانفرنس کے ایک ممبر تھے اور اس کو پورا تعاون دیتے تھے۔ وہ بڑے فراخ دل تھے۔ ذہین طلباء کو اپنی طرف سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے وظیفہ بھی دیتے تھے۔ شیخ صاحب بھی اُن کے پاس گئے اور مالی مدد کی درخواست کی۔ شاہ صاحب نے شیخ صاحب کو ہدایت کی کہ جب وہ لاہور سے فارغ التحصیل ہونگے تو اُن کے پاس آئیں تا کہ وہ ان کی مدد کریں۔ فارغ ہو کر کشمیر آنے سے پہلے شیخ صاحب محسن صاحب سے ملے۔ انہوں نے شیخ صاحب کو اپنا مہمان بنایا اور رخصت ہونے کے وقت روپیوں کی ایک تھیلی بھی نذر کی اور کہا کہ ہم تمہاری گھریلو حالت سن کر بے حد متاثر ہوئے ہیں۔ یہ ہماری طرف سے تمہیں قرض حسنہ ہے۔ جب تم پڑھ لکھ کر کچھ بنو گے تو ہم سمجھیں گے کہ تم نے ہمارا قرضہ اُتار دیا۔ لاہور اور علیگڑھ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۲ اپریل ۱۹۳۰ء کو شیخ صاحب سرینگر کی طرف روانہ ہوئے۔

تذکرۃ الصالحین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت نبی کریم ﷺ اور امی عائشہؓ کے نکاح کی صحیح نوعیت

[ملک محمد جاوید]

بِسم اللہِ الصّلاۃ والسّلامُ علیٰ رسولِ اللہ ﷺ

تمام تعریفیں اس پروردگار کیلئے جو کائنات کا تنہا خالق و مالک ہے اور لاتعداد دُرود وسلام ہو اسکے آخری نبی (ﷺ) پر جس نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

اس بات کے سبھی حضرات معترف ہونے چاہیے کہ آج جس دور میں ہم زندگی گزار رہے ہیں، یہ امت مُسلمہ کیلئے دینی وایمانی اعتبار سے نہایت ہی پُر خطر دور ثابت ہو رہا ہے۔ایک طرف سے باطل کی ہمیشہ سے یہ مذموم کوشش رہی ہے کہ مسلمان کبھی بھی چین وسکون اور امن وامان کے ساتھ زندگی نہ گزاریں، دوسری طرف وہ نہایت ہی مستعد ثابت ہو رہے ہیں کہ مسلمان اپنے ہی مذہب سے دور رہے یا کم از کم انکے اندر دین وایمان کی فکر کم ہو جائے، بالفاظ دیگر وہ (باطل) انہی (مسلمانوں) کے ایک طبقہ، جو دینی وفکری اعتبار سے بالکل بے حس و بے خبر ہے کے ذہنوں میں انکے پاکیزہ مذہب میں غلط وقبیح تاویلیں کر کے شکوک وشبہات پیدا کرتے ہیں۔گر چہ وہ سارے شکوک وشبہات عقلی ونقلی حیثیت سے بے بنیاد ہوتے ہیں مگر بد قسمتی سے اس پروپیگنڈہ کی زد میں آکر، نوجوانانِ ملت، خصوصًا وہ طبقہ جو مغربی تہذیب وتمدن اور علوم وفنون میں منہمک ہیں، اپنے ہی دین سے دور و بدظن ہو جاتے ہیں۔چونکہ انکے پاس معلومات بہت ہی قلیل بلکہ نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں جسکی وجہ سے انکا کمزور ایمان اس پرپیگنڈہ کی وجہ سے متزلزل ہو جاتا ہے۔

فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز ویمن سے نکال دو

چنانچہ معترضین و مستشرقین کا کام ہی یہ ہے کہ وہ اسلامی تاریخ و تعلیم میں رنگ آمیزیاں ومبالغہ آرائیاں کرکے، مسلمان جوان طبقے کے ذہن میں اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں مہمل و بے سروپا اعتراضات وسوالات کھڑے کرتے ہیں۔ چونکہ پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات اقدس اتنی پُرکشش اور عدل وانصاف، تقوی و پرہیزگاری، دیانت وشرافت، صداقت وامانت غرض ہر قسم کے اوصاف سے مرصّع ومزیّن ہے کہ جو کوئی بھی آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا غیر جانبداری وبغیرِ تعصب کے بغور مطالعہ کرتا ہے وہ ایک دم، بلاکسی کراہت کے آپ ﷺ کی صدقِ دل سے تصدیق کرتا ہے۔ لہذا باطل ہمیشہ سے آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس کو غلط طور سے پیش کرنے کی پیہم کوششیں کرتے آرہے ہیں، تاکہ کسی بھی طرح لوگ آپ ﷺ کے متعلق غلط سوالات وشبہات کا شکار ہوجائیں

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا

روحِ محمد ﷺ انکے بدن سے نکال دو

لیکن یاد رہے، معترضین ودشمنانِ اسلام کا یہ حربہ، ان کی حماقت کی صریح نشانی ہے، کیونکہ جس طرح آسمان کی طرف پتھر مارنے سے کوئی ستاروں کو توڑ نہیں سکتا، دریا کی تیز رفتار روانی میں پتھر پھینک کر کوئی اس کی موجوں کو روک نہیں سکتا، اسی طرح آپ ﷺ کی سیرت طیّبہ کے متعلق اعتراضات وسوالات کھڑے کرنے سے باطل آپ ﷺ کے نورِ ہدایت وپیغامِ الٰہی کو کم نہیں کرسکتا۔

اگرچہ علماء کرام نے ان کے سارے اعتراضات کے تسلی بخش جوابات پیش فرمائے ہیں۔ لیکن اس مقالہ میں، ہم صرف اپنی کم بساط کے مطابق ان کے ایک سوال اور اسکے ادنیٰ جواب پر تھوڑی بہت گفتگو کریں گے۔

معترضین کا دعوی ہے کہ (العیاذ با اللہ، نقل کفر، کفر نباشد) پیغمبر اسلام لطف اندوز شخص تھے، کیونکہ انہوں نے پچپن سال کی عمر میں ایک ایسی لڑکی سے شادی فرمائی، جس کی عمر اُس وقت تقریباً نو یا دس سال تھی۔

محترم قارئین کرام:

ہم سب بخوبی اس چیز سے واقف ہیں کہ انسان کی عمر جب بلوغت کو پہنچ جاتی ہے، تب اس کے اندر فطری خواہشات کے تقاضے پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ یہ مخصوص عمر

تقریباً بیس سال سے لیکر چالیس سال تک، اپنے اند جذبات و احساسات کے ساتھ متحرک ہوتی ہے۔ جوں جوں آدمی کی عمر چالیس سال سے متجاوز ہوتی جاتی ہے جبلّی و خلقی طور پر اسکے اندر یہ جذبات کمزور پڑ جاتے ہیں اور یہ قاعدہ دنیا کے تمام اطباء و حکماء کے نزدیک بلا کسی تعریض کے مسلّم ہے۔

اس مختصر تمہید کو سامنے رکھ کر، اب ہم پیغمبر اسلام ﷺ کی پاکیزہ و مبارک زندگی پر نظر ڈالیں، تو ہمیں یہ حقیقت اپنی آنکھوں کے سامنے عیاں نظر آئے گی کہ آپ ﷺ کی عمرِ مبارک جب ٹھیک پچیس (۲۵) سال کو پہنچی، تب آپ ﷺ نے ایک ایسی خاتون سے عقد فرمایا، جسکی عمر اُس وقت چالیس سال سے کم نہ تھی۔ نیز اس بیاہ سے پہلے اس خاتون کے مزید دو نکاح ہو چکے تھے اور ان شوہروں سے کچھ بچے بھی پیدا ہوئے تھے۔

خدارا غور فرمائے! کیا کوئی جوان، جو نہایت خوبصورت بھی ہو، کامل الفطرت بھی ہو، انسانی و عربی جوانمرادی اور جسمانی صحت کا اعلیٰ و بہترین پیکر بھی ہو، تہذیب و تمدن کے جملہ امراض وعیوب سے بالکل پاک بھی ہو اور شہسواری اور مردانگی کے اعلیٰ مقام پر فائز بھی ہو، کسی ایسی خاتون سے اس جوانی میں عقد کر سکتا ہے؟۔ ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ ہر جوان کے لئے مستبعد و مُحال ہے۔ اور اگر کوئی جوان بطیّب خاطر اپنی عین جوانی میں ایسی بوڑھی خاتون سے نکاح کرنے کو راضی ہوتا ہے، تو ہم ہمیشہ اسکی شرافت ونجابت کو سلام کرینگے چہ جائیکہ ہم اس کو طعن و تشنیع کا مرکز بنائیں۔

قربان جایئے اپنے پیغمبر اسلام ﷺ پر جس کی سیرت ہر عیب و کمی سے پاک و منزّہ ہے، جس نے عین جوانی میں خوشی وانبساط کے ساتھ حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ سے عقد فرمایا، اور آگے چل کر اپنی ساری جوانی کیا، زندگی کے مزید پچیس سال حضرت خدیجہؓ سے خوشی خوشی گزارے، اس دوران یعنی حضرت خدیجہؓ کے ہوتے ہوئے آپ ﷺ نے کوئی دوسرا نکاح بھی نہیں فرمایا، یہاں تک کہ جب آپ ﷺ کی عمر مبارک پچاس سال کو پہنچی، تب آپ ﷺ کی یہ زوجہ محترمہ (حضرت خدیجہؓ) پیسٹھ (۶۵) سال کی عمر میں اس دارِفانی سے رحلت فرما گئی۔

یاد رہے، کہ باستثنائے حضرت ابراہیمؑ آپ ﷺ کی تمام اولاد حضرت خدیجہؓ ہی کے بطن سے پیدا ہوئیں۔ (یعنی جو شادیاں آپ نے بعد میں فرمائیں وہ کسی لُطف اندوزی کیلئے نہیں بلکہ انہی بچوں کی پرورش وتربیت اور دینی اشاعت وترویج کی غرض وغایت کو سامنے رکھ کر فرمائیں۔)

اب جب ان بچوں کی والدہ ماجدہ، انتقال فرما گئی تو آپ ﷺ نے ان ہی بچوں (جن میں چار لڑکیاں اور تین لڑکے ہیں مگر وہ لڑکے ماں سے پہلے ہی وفات پا چکے تھے) کی پرورش وتربیت کی خاطر دوسری شادی کرنے کا ارادہ فرمایا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد بھی ایک ایسی عورت سے عقد فرمایا، جو حضرت خدیجہؓ کی مانند پہلے ہی سے بیوہ اور کئی بچوں کی ماں تھی۔

حافظ ابن کثیرؒ، امام احمدؒ سے نقل فرماتے ہیں کہ:۔

''رسول اللہ ﷺ نے حضرت سودہؓ کو نسبت کا پیغام بھیجا اور وہ (پہلے سے ہی) پانچ یا چھ یتیم بچوں کی ماں تھی، اس نے پس وپیش کیا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، آپ کو کیا چیز مانع ہے؟ تو اس نے کہا واللہ یا رسول اللہ ﷺ آپ کے جملہ کائنات سے محبوب ترین ہونے میں کوئی امر مانع نہیں، بجز اسکے کہ یہ (میرے) بچے صبح وشام آپ کو ﷺ کو تنگ کریں گے، تو آپ نے پوچھا اسکے علاوہ کوئی اور مانع ہے؟ تو اس نے عرض کیا، جی نہیں تو آپ نے فرمایا اللہ تجھ پر رحمت کرے، بیشک بہترین عورتیں جو اونٹوں پر سوار ہوتی ہیں (یعنی عرب کی عورتیں) قریش کی نیک عورتیں ہیں، جو بچوں پر شفیق ومہربان اور شوہر کے مال کی محافظ ونگران ہیں۔'' [1]

اگر چہ اس میں اختلاف ہے کہ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد آپ ﷺ نے حضرت سودہؓ اور حضرت عائشہؓ میں سے پہلے کس کے ساتھ عقد فرمایا، جیسا کہ بعض محققین کہتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ سے نکاح تو پہلے ہی سے طے ہوا تھا مگر رخصتی ہجرت کے بعد وقوع پذیر ہوئی۔ لیکن یہ بات قطعی راجح وصحیح ہے کہ حضرت سودہؓ سے نکاح مع رخصتی ہجرت سے پہلے، بلکہ حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے چند ہی دنوں بعد ہوا تھا۔

ابن ہشام کی روایت ہے کہ:۔

''حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے کچھ ہی روز بعد حضرت سودہؓ آپ ﷺ کے نکاح میں آئیں'' [2]

حافظ ابن کثیرؒ ابن عبد البرؒ سے ناقل ہے:۔

''ابن عبد البرؒ کا مختار قول یہ ہے کہ (حضرت) سودہؓ سے نکاح حضرت عائشہؓ سے قبل ہوا۔ ابن عبد البرؒ نے یہ قول قتادہ اور ابو عبید سے نقل کیا ہے اور کہتے ہیں کہ عقیل نے بھی زہری سے یہی بیان فرمایا ہے'' [3]

ابن کثیرؒ اپنی تاریخ ''البدایہ والنہایہ'' میں نقل کرتے ہے کہ:۔

''آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے قبل، حضرت سودہؓ سے نکاح کیا، یہ بات ابن اسحاق وغیرہ نے بیان کی ہے''۔[۴]

زرقانی کی بھی ایک روایت ہے کہ:۔

''صحیح اور راجح قول یہی ہے کہ حضرت سودہؓ کا نکاح (حضرت عائشہؓ) سے پہلے ہوا اور چارسو(۴۰۰) درہم مہر قرار پایا''[۵]

غرض، ان تمام روایات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد آپ ﷺ نے دوسری شادی ایک ایسی خاتون سے فرمائی جو بیوہ ہونے کے ساتھ ساتھ پانچ چھ یتیم بچوں کی ماں بھی تھی۔ کیا یہ صراحتاً شرافت ونجابت کی کھلی دلیل نہیں کہ آپ ﷺ نے اپنی تمام جوانی عمر رسیدہ بیواؤں کے ساتھ گزاری۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اعداء اللہ کے شر سے محفوظ و مامون فرمائے۔ پھر جب آپ ﷺ کی عمر مبارک تقریباً پچپن (۵۵) سال کو پہنچی تب آپ ﷺ نے ہجرت کے دوسرے سال ماہ شوال میں حضرت عائشہؓ سے مدینہ منورہ میں عروسی فرمائی جبکہ ان کی عمر اس وقت نو یا دس سال تھی۔ مگر یہاں ایک بات نہایت ہی قابل التفات ہے کہ، حضرت عائشہؓ کے ساتھ عقد کا فیصلہ آپ ﷺ نے خود تجویز فرمایا تھا، یا پھر کسی اور کی مشیّت وارادے سے آپ ﷺ کو یہ شادی کرنی پڑی؟ بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ آپ ﷺ نے یہیں سے خواستگاری کی ہوگی، یہیں سے مطالبہ کیا ہوگا لیکن حقیقت قطعی یہ نہیں ہے، بلکہ کچھ اور ہی ہے۔

دراصل، آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا تھا، کہ آپ اپنے یار گار، محبِ جانثار ابوبکر ابن ابی قحافہؓ کی صاحبزادی (عائشہؓ) سے نکاح فرمائیں۔ چنانچہ بخاری شریف کی روایت ہے کہ:۔

وَعَن عَائِشَة قَالَت: قَالَ لِی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عليهِ وَسلَّمْ أُرِيتُكَ فِي المَنَامِ ثَلَاثَ لَيَالٍ ، يُجِيء بِكَ المَلَكُ فِي سَرَقَةٍ مِّن حرِير ،فَقَالَ لِي ، هٰذِه امرَأتُكَ، فَكَشَفتُ عَن وَ جَهِكَ، الثّوابَ فَإِذَاأَنتِ هِيَ ، فَقُلتُ: ان يّكُن هٰذَا مِن عِندِ اللّٰهِ يُمضِهِ. (رواه البخاری ومسلم)

ترجمہ: ’’حضرت عائشہؓ سے روایت ہے، انہوں نے بیان کیا کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کہ تم مجھے خواب میں تین رات دکھائی گئیں، فرشتہ ریشمی کپڑے کے ایک ٹکڑے میں تمہیں لے کر آتا، اور مجھ سے کہتا کہ یہ آپ کی بیوی ہیں، تو میں نے تمہارے چہرے سے کپڑا اٹھایا، تو دیکھا کہ وہ تم ہو، تو میں نے کہا کہ اگر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو وہ اس کو پورا فرمائے گا‘‘

ترمذی شریف کی ایک روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

’’جبرائیل میرے پاس آئے اور یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ، نے آپ ﷺ کا نکاح ابوبکرؓ کی بیٹی (عائشہؓ) سے کردیا اور جبرائیل کے ساتھ عائشہ کی ایک تصویر بھی تھی، جو مجھ کو دکھائی اور کہا یہ آپ کی (ہونے والی) بیوی ہیں‘‘ ۶

لیکن وہ کیا کیا حکمتیں و مصلحتیں ہو سکتی تھیں، جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہؓ کو کم عمری میں ہی اپنے آخری نبی ﷺ کے لئے منتخب فرمایا، ظاہر ہے کہ وہ سب باتیں اللہ ہی کے علم میں ہونگی، مگر ہم یہاں پر کچھ ایسی حکمتوں کا تذکرہ کریں گے، جو بنظر غائر سیرت کا مطالعہ کرنے سے سمجھ میں آئیں۔

دراصل اللہ تعالیٰ کا منشا تھا کہ نبی کریم ﷺ کے گھر میں ایک ایسی عورت آنی چاہے، جو نہایت ذہین، بیدار مغز، مضبوط دل کی حامل اور منفرد قسم کے اوصاف وخوبیوں کی مالک ہو، جو نبی ﷺ کی اندرونی وخانگی زندگی کو مکمل طور پر محفوظ کر سکے، جیسا کہ ہم سب بخوبی جانتے ہے کہ نبی جب مسجد میں ہو، تب بھی نبی ہے، میدان کارزار میں ہو تب بھی نبی ہے، اپنے اصحاب کے ساتھ گفت وشنید فرمارہے ہوں تب بھی نبی ہے، وغیرہ۔ اسی طرح جب وہ گھر میں ہو تب بھی نبی ہے، وضو وغسل فرمارہے ہوں تب بھی نبی ہے، بستر پر آرام فرمارہے ہوں تب بھی نبی ہے، اپنی اہلیہ کے ساتھ دینی وضروری مسائل پر گفتگو فرمارہے ہوں تب بھی نبی ہے۔ غرض نبی کا ایک ایک لمحہ، ایک ایک قول وعمل، اُمت کے لئے ہدایت وعمل کرنے کی مشعل راہ ہوتی ہے۔ اگر بیرونی زندگی کے اعمال وامور جو مسجد، دعوت وتبلیغ، نشست وبرخواست، میدان کارزار وغیرہ کے متعلق ہوں، آپ کے اصحاب ریکاڈ کریں گے۔ لیکن گھریلو وخانگی زندگی کا صحیح نقشہ اور عورتوں کے ضروری ونجی مسائل اُمت کے تمام افراد خصوصاً اُمت کی خواتین تک، پہنچانے کے لئے کوئی ایسا لائق ذریعہ ہونا چاہے جو بآسانی یہ کام انجام دے سکے۔

اسی لئے ان سارے امور کی انجام دہی کیلئے، اللہ کی مشیت داعی ہوئی کہ نبی ﷺ کے گھر میں ایک ایسی خاتون آنی چاہئے، جو نبی ﷺ کی ساری پرائیویٹ زندگی محفوظ کر سکے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس خاتون کی عمر نبی ﷺ کی زوجیت میں آنے کے وقت بہت کم ہونی چاہیے۔ کیونکہ نبی ﷺ جب اس دنیا سے رخصت ہو جائے، تو وہ اس کے بعد طویل زمانے تک زندہ رہنی چاہیے، تاکہ اس طویل زمانے میں وہ اپنی ساری ذمہ داریاں اچھی طرح سے انجام دے سکے، جس کیلئے اللہ تعالیٰ نے اسے مامور کیا تھا۔ چنانچہ، بعد وفات النبی ﷺ حضرت عائشہ ۴۸ سال تک زندہ رہی۔

یاد رہے، عورت کی ساری سرگرمیاں اس وقت ختم ہو جاتی ہیں، جب اس کو منجاب اللہ اولاد عطا ہوتی ہے اور اسکی ساری توجہ اس اولاد کی طرف مڑ جاتی ہے۔ اسی لئے حضرت عائشہؓ کو اولاد کے بوجھ سے بھی بچانا ہے، تاکہ اس کی تمام تر توجہ صرف اسی اہم ترین کام کی طرف مبذول رہنی چاہیے، جس کیلئے اس کو نبی ﷺ کی زوجیت میں آنے کا شرف بخشا گیا تھا۔

نیز اللہ کے نبی ﷺ جب اس دار فانی سے رخصت ہونے کے قریب ہو، تو ان آخری ایام کے سارے امور، حرکات وسکنات کا صحیح ریکارڈ اسی خاتون کے توسط سے ہونا چاہیے، چنانچہ مرض الوفات میں آپ ﷺ نے باقی ازواج مطہرات سے اس بات کی اجازت چاہی کہ آپ ﷺ یہ (آخری) ایام عائشہؓ کے حجرہ میں گزارنا چاہتے ہیں۔

زرقانی کی ایک روایت ہے کہ:

"جب (آپ ﷺ کے) مرض میں شدت ہوئی تو (آپ ﷺ) ازواج مطہرات سے اجازت لے کر حضرت عائشہؓ کے یہاں تشریف لے آئے۔ دوشنبہ کے روز حضرت عائشہ کے حجرے میں منتقل ہوئے اور آئندہ دوشنبہ کو حضرت عائشہ ہی کے حجرہ میں رحلت فرمائے عالم آخرت ہوئے، تیرہ یا چودہ روز علیل رہے۔ جس میں آخری ہفتہ کی تیمارداری عائشہؓ صدیقہ کے حصہ میں آئی" ۔

مزید برآں، عالم نزع میں بھی یہ خاتون آپ ﷺ سے متصل یعنی قریب ترین ہونی چاہیے، تاکہ آپ ﷺ کے آخری کلمات و حرکات کو بخوبی بچشم دیکھ کر یہ خاتون محفوظ کر کے، امت تک پہنچا

سکے۔ چنانچہ جس دن آپ ﷺ اس دار فانی سے رحلت فرما گئے، اس دن آپ ﷺ لوگوں (اصحاب) کو پچھلے دنوں (جن میں آپ ﷺ زیادہ بیمار تھے) کے مقابلے میں سکون وراحت محسوس کرتے ہوئے دیکھے، اس لئے آپ ﷺ کے اصحاب جواب تک آپ ﷺ کے شمع نبوت کے اردگرد پروانوں کی طرح لپٹے ہوئے تھے، اب منتشر ہوگئے مگر کچھ دیر نہ گزری تھی کہ عالم نزع شروع ہوگیا۔ آپ ﷺ عائشہؓ کی آغوشِ مبارک میں سر رکھ کر لیٹ گئے۔ اتنے میں حضرت عائشہؓ کے بھائی حضرت عبدالرحمن بن ابوبکرؓ ہاتھ میں مسواک لئے ہوئے حجرہ میں داخل ہوئے۔ آپ ﷺ ان کی طرف دیکھنے لگے، تو حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا:۔ یارسول اللہ، کیا آپ کیلئے مسواک لے لوں؟ آپ ﷺ نے اشارہ فرمایا ہاں۔ میں نے چبا کر وہ مسواک آپ کو دی۔ اسی وجہ سے عائشہ صدیقہ بطور فخر اور بطور تحدیث بالنعمتہ یہ کہا کرتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ نے اخیر میں میرا آبِ دہن آپ کے آب دہن کے ساتھ ملا دیا۔ آپ کی وفات میرے حجرے میں، اور میری نوبت کے دن میں اور میرے سینہ اور ہنسلی کے درمیان ہوئی۔

حافظ ابن کثیر ''البدایہ والنہایہ'' میں بحوالہ ابن ملیکہ بیان کرتے ہیں، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ:۔

''رسول اللہ ﷺ نے میرے گھر میں اور میرے سینے اور ٹھوڑی کے درمیان وفات پائی اور جب آپ (زیادہ) بیمار ہوئے تو جبرائیل آپ کیلئے ایک دعا کرتے تھے، بس میں بھی آپ کیلئے دعا کرنے لگی، تو آپ ﷺ نے آسمان کی طرف اپنی نگاہ اُٹھائی اور فرمایا۔ فی الرفیق الاعلیٰ. فی الرفیق الاعلیٰ''۔ ۸

نیز حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ:

''آپ ﷺ کے سامنے برتن پڑا تھا جسمیں پانی تھا، آپ نے ہاتھ کو پانی میں ڈال کر اسے اپنے منہ پر ملنے لگے، پھر فرمانے لگے، ''لا الٰہ الا اللہ'' بیشک موت کی کچھ سختیاں ہیں، پھر آپ نے اپنی بائیں انگلی کھڑی کی اور فرمانے لگے، فی الرفیق الاعلیٰ، فی الرفیق الاعلیٰ، یہاں تک کہ آپکی روح (مبارک) قبض ہوگئی اور آپ ﷺ کا ہاتھ پانی میں پڑ گیا'' ۹

غرض ان آخری لمحات میں آپ ﷺ پر جو کیفیت طاری ہوئی، جو جو باتیں آپ ﷺ نے فرمائیں وہ تقریباً ساری روایات عائشہؓ ہی سے مروی ہیں۔ چونکہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کا انتخاب

اللہ تعالیٰ نے بہت ہی عظیم کام کے لئے مقرر فرمایا تھا۔ اسی لئے ان کی پیدائش ولڑکپن کی تربیت ایک اعلیٰ کردار والے گھر میں ہوئی۔ بچپن ہی سے باپ کی فہم وفراست اور مقام صدیقیت سے خاص حصہ پایا تھا۔ والدہ ایسی اوصاف کی مالک تھیں جن کی نسبت آنحضرت ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ ''جو شخص حورعین کو دیکھنا چاہے وہ ام رومان کو دیکھ لے'' اس لئے اللہ تعالیٰ کی مشیت وعنایت اسکی داعی ہوئی کہ اپنے پیغمبر ﷺ کے یارغار اور محبّ خاص کی دختر نیک اختر کو بچپن ہی سے پیغمبر ﷺ کی زوجیت میں دیا جائے۔ کیونکہ لوح قلب اب تک بالکل پاک وصاف ہے، کوئی باطل نقش ابھی تک اس پر نہیں کھینچا گیا، خود بچپن کا زمانہ معصومیت کا زمانہ ہوتا ہے۔ نیز ماں باپ کی طرف سے بھی کسی نقشِ باطل کا امکان نظر نہیں آتا، باپ تو صدیق اکبر ہے۔ رشک ملائک ہے، ماں ہے جو حورعین کا نمونہ ہے۔ ایسے لوح قلب پر علم نبوت کا جو بھی نقش کھینچا جائے گا وہ ایسا مستحکم وپائیدار ہوگا کہ اس کا مٹنا بالکل مُحال وناممکن ہوگا۔

غرض بچپن سے ہی آپ ﷺ کے والدین، یہاں تک کہ آپ ﷺ خود، آپؓ کی تربیت میں نہایت ہی محتاط رہتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ، آپؓ اپنے دروازے پر رورہی تھی، اتنے میں آنحضرت ﷺ تشریف لائے اور آپؓ سے رونے کی وجہ پوچھی۔ تو انہوں نے اپنی والدہ کی شکایت کی کہ وہ مجھے ڈانٹتی ہیں یہ سن کر آپ ﷺ آبدیدہ ہوگئے، آپ ﷺ نے ام رومانؓ سے فرمایا:۔

''کیا میں نے تمہیں عائشہؓ کے بارے میں اچھا ونرم سلوک کرنے کو نہیں کہا تھا؟ اور کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ انکے سلسلے میں میری حفاظت کرنا، انہوں نے کہا کہ یہ ابوبکرؓ کو میری باتیں بتلاتی ہیں، پھر وہ مجھ سے خفا ہوتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگرچہ انہوں (عائشہ) نے ایسا ہی کیا ہو، ام رومانؓ بولیں (مجھے ڈر ہے) کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ قبیح عادت ان میں پختہ نہ ہو جائیں''۔ ۱۰

سب سے اہم کام، آپؓ کیلئے وہ تمام علوم واعمال، جو آنحضرت ﷺ سے آپؓ نے بچشم دیکھے اور عملاً سیکھے تھے، امت تک صحیح تناسب وتناظر میں پہنچانے تھے۔ چنانچہ بعد وفات النبی ﷺ، جب کبھی بھی صحابہؓ کے درمیان کسی مسئلہ کے بارے میں اختلاف رائے ہوتا تھا، تو حضرت عائشہؓ فوراً آنحضرت ﷺ کی آخری سنّت کے مطابق فیصلہ سنا دیتی تھی۔ کیونکہ علم وفضل میں حضرت عائشہؓ کو نہ صرف عورتوں پر، نہ صرف دوسری امہات المومنینؓ پر، نہ صرف کچھ صحابہؓ

پر، بلکہ باستثنائے چند مخصوص صحابہؓ کے تمام صحابہؓ پر تفوق حاصل تھا۔

جامع ترمذی کی روایت ہے کہ:۔

عَنْ اَبِي مُوسیٰ قال: مَااشكَلَ عَلَينَا اَصحاب رَسولِ اللهِ ﷺ . حَدِيث قطُ فَسأَلنَاعائِشةَ اِلّا وَجدنا عِندَ ها مِنهُ عِلمًا. (رواه الترمذی)

ترجمہ: ''حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت ہے کہ جب کبھی ہم لوگوں یعنی رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کو، کسی بات اور کسی مسئلہ میں اشتباہ ہوتا، تو ہم نے ام المومنین عائشہؓ سے (جب بھی کسی مسئلہ کے بارے میں) دریافت فرمایا تو ان کے پاس اس کے بارے میں علم پایا''۔ [۱۱]

امام زہریؒ جو اکابر تابعین میں سے تھے، فرماتے ہیں:۔

'' كانت عائشةاعلم الناس يسئلها الا كابر'' [۱۲]

ترجمہ:۔ ''عائشہؓ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ عالم تھیں بڑے بڑے اکابر (صحابہؓ) ان سے (مسئلے) پوچھا کرتے تھے''۔

حضرت عائشہؓ کا شمار مجتہدین صحابہؓ میں سے ہے، اوراس حیثیت سے وہ اس قدر بلند مرتبہ رکھتی تھیں کہ محدثین وفقہائے کرام بے تکلف ان کا نام حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ جیسے جلیل القدر صحابہؓ کے ساتھ لیتے ہیں۔ چنانچہ وہ حضرت صدیق اکبرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانے میں فتوے دیتی تھیں۔ یاد رہے کہ حضرت عائشہؓ سے ایک ہزار سے اوپر احادیث نبوی ﷺ مروی ہیں۔

عروہ بن زبیرؓ فرماتے ہیں کہ:۔

''مَارَاَيتُ اَحَدًا اَعلَمِ بِالقُرانِ وَلَا بفَرِيضَةٍ وَلَابحَرَامٍ وَلا بِحَلالٍ وَلَابِفقهٍ وَلَا بِشعرٍ وَلَا بِطبّ وَلَا بِحَلِيثِ العَرَبِ وَلَا نَسَبِ مِن عَائِشَةَ '' [۱۳]

ترجمہ: '' میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جو، کتاب اللہ اور فرائض کے بارے میں، اور حرام وحلال اور فقہ کے بارے میں اور شعروادب اور طبّ کے بارے میں اور عربوں کے واقعات اور تاریخ کے بارے میں اور انساب کے بارے میں (ہماری خالہ جان) عائشہؓ سے زیادہ علم رکھتا ہو''۔

نیز علم الکلام کے متعدد مسائل آپؓ کی زبان سے ادا ہوئے، چنانچہ رویت باری، علم غیب، عصمتِ

انبیاء، اسراء ومعراج، ترتیب خلافت اور سماع موتی وغیرہ کے متعلق انہوں نے دقیق روشنی ڈالی ہے۔ اسکے علاوہ علم اسرار الدین کے متعلق بھی انہوں نے بہت سے مسائل جیسے قرآن کریم کی ترتیب، نزولِ قرآن، نمازِ قصر کی علت، صوم عاشورہ کا سبب، حج کی حقیقت اور مطالب ہجرت کے بارے میں انہوں نے خاص توضیحات فرمائی ہیں۔ اسکے ساتھ ساتھ آپؓ نہایت ہی شیرین کلام اور فصیح اللسان تھیں۔ چنانچہ جامع ترمذی میں موسیٰ بن طلحہ کا قول نقل ہے کہ:۔

"مَارأیتُ افصح مِن عائشة" [۱۴]

ترجمہ:۔ "میں نے حضرت عائشہؓ سے زیادہ کسی کو فصیح اللسان نہیں دیکھا"۔

غرض ام المومنین عائشہ صدیقہؓ دین کے ہر شعبہ میں مہارت رکھتی تھیں۔ مسلم حضرت مسروق سے نقل کرتے ہیں کہ ان سے پوچھا گیا کہ، کیا حضرت عائشہؓ علم الفرائض (علم میراث) میں بھی مہارت رکھتی تھی، تو انہوں نے فرمایا:

"ہاں قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں نے مشائخ صحابہ کرامؓ کو اور کبار درجہ کے لوگوں (تابعین) کو فرائض (میراث) کے مسائل ان (عائشہ) سے معلوم کرتے دیکھا ہے" [۱۵]

حضرت عائشہؓ آپ ﷺ کی واحد زوجہ محترمہ تھی جن کو حضرت جبرائیل امینؑ کو دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

مشہور تابعی مسروق کہتے ہیں کہ مجھ سے خود حضرت عائشہ صدیقہ نے بیان فرمایا:

"میں نے جبرائیل امین کو اپنے اس حجرہ کے دروازے کے قریب گھوڑے پر سوار دیکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان سے سرگوشیاں فرمار ہے تھے، جب آپ ﷺ حجرہ میں داخل ہوئے تو میں نے عرض کیا، یہ کون تھے جن سے آپ ﷺ سرگوشیوں میں بات چیت فرمار ہے تھے؟ آپ نے فرمایا: کیا تم نے ان کو دیکھ لیا ہے؟ میں نے عرض کیا جی ہاں، آپ ﷺ نے پوچھا کہ، تم نے ان کو کس کے مشابہ پایا ہے؟ میں نے عرض کیا "دحیہ کلبیؓ" کے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم نے خیر کثیر دیکھی ہے، یہ جبرائیل امین ہیں، کچھ دیر کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے عائشہ: یہ جبرائیل امین، تمھیں سلام کہہ رہے ہیں، میں نے جواب میں کہ کہ وعلیہ السلام، اللہ تعالیٰ اس کو بہترین اجر وصلہ فرمائے جو خیر کے ساتھ داخل ہوا" [۱۶]

حوالہ جات

۱۔ حافظ ابن کثیرؒ ''سیرۃ النبی ﷺ''۔ (ترجمہ مولانا ھدایت اللہ ندوی) حافظی بکڈ پو دیوبند ج۔(۱)۔ص(۴۰۰)

۲۔ ابن ھشام۔ بحوالہ مولانا ادریس کاندھلویؒ ''سیرۃ المصطفیٰ ﷺ''۔ ج(۳) ص(۲۰۴) کتب خانہ اعزازیہ دیوبند (یوپی)

۳۔ ابن کثیرؒ ''سیرۃ النبی ﷺ'' (ترجمہ مولانا ھدایت اللہ ندوی) ج (۱) ص (۴۰۱) حافظی بک ڈپو دیوبند

۴۔ ابن کثیرؒ ''البدایہ والنہایہ'' (ترجمہ مولانا اختر فتح پوریؒ) ج(۵) ص(۴۹۳) مکتبہ دانش دیوبند یوپی۔

۵۔ زرقانی۔ بحوالہ۔ مولانا ادریس کاندھلویؒ ''سیرۃ المصطفیٰ ﷺ'' ج(۳) ص(۲۰۵) کتب خانہ اعزازیہ دیوبند۔

۶۔ جامع ترمذی۔ بحوالہ سیرۃ المصطفیٰ ﷺ از مولانا ادریس کاندھلویؒ ج(۳) ص(۲۰۷) کتب خانہ اعزازیہ دیوبند یوپی

۷۔ زرقانی۔ بحوالہ۔ مولانا ادریس کاندھلوی ''سیرۃ المصطفیٰ ﷺ'' ج(۳) ص(۶۶) کتب خانہ اعزازیہ دیوبند

۸۔ ابن کثیرؒ ''البدایہ والنہایہ'' (ترجمہ مولانا اختر فتح پوریؒ) ج (۵) ص (۴۰۴) مکتبہ دانش دیوبند

۹۔ حوالہ مذکور۔ ج(۵) ص(۴۰۵)

۱۰۔ ابن سعد۔ ''طبقات'' (ترجمہ علامہ عبداللہ العمادی مرحوم و مولانا محمد اصغر) ج(۸) ص (۶۷) حافظی بکڈپو دیوبند طبع سال ۲۰۰۰ء

۱۱۔ جاالترمذی۔ بحوالہ مولانا منصور احمد نعمانی ''معارف الحدیث''۔ ج (۸) ص (۳۱۱) دار الشاعت کراچی پاکستان

۱۲۔ مولانا شاہ معین الدین ندوی ''سیَر الصحابہؓ'' ج (۱) ص(۴۳) کتب خانہ نعیمیہ دیوبند

۱۳۔ جامع ترمذی۔ بحوالہ مولانا منظور نعمانی ''معارف الحدیث'' (ج)۸ ص(۳۱۲) طبع دار الاشاعت کراچی پاکستان۔

۱۴۔ جامع ترمزی بحوالہ مولانا شاہ معینالدین ندوی ''سیَر الصحابہؓ'' ج(۱) ص (۴۵) کتب خانہ نعیمیہ دیوبند

۱۵۔ ابن سعد ''طبقات'' (مولانا عبداللہ العمادی مرحوم و مولانا محمد اصفر) ج (۸) ص(۵۷) حافظی بک ڈپو دیوبند۔

۱۶۔ ایضاً ۔ج۔(۸) ص (۵۹)

اقبال محسن انسانیت کے حضور میں ہی کیوں؟

(مولانا نورالزمان الندوی)

قرآن کی زبان میں محسن وہ ہے جس نے اپنے آپ کو کلی طور پر خدا کے سپرد کر دیا ہو۔ من اسلم وجہ للہ فھو محسن۔ چون کہ معلوم تاریخ میں نبی اکرم ﷺ کی مبارک زندگی کے سوا کسی کی زندگی اتنی جامعیت کے ساتھ اس معیار پر نہیں اترتی اس لیے آپ سے بڑا کوئی انسانیت کا محسن اور کرم فرما ہو! اس کا تصور بھی ممکن نہیں۔

انسانیت مذکورہ بالا عنوان میں اس معنی میں مستعمل ہے جس کے قرآن کریم میں ''ناس'' کا لفظ مستعمل ہے۔ یعنی بنی نوع انسان: رہی بات لفظ انسان کی تو وہ قرآن کریم میں ۵۶ مقامات پر اپنی متنوع خصائص کے ساتھ مستعمل ہے۔

حضور کا لفظ غالباً قرآن کریم میں استعمال نہیں ہوا۔ مجھے اس جستجو کی زحمت اس لیے اٹھانی پڑ رہی ہے کہ اقبالیات کے تقریباً سبھی ناقدین اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ اقبال کے فلسفہ کا فن کا بنیادی اور اہم مصدر قرآن کریم ہے اور انسان جب کسی ماحول میں زندگی گذارتا ہے، تو وہ شعور اور غیر شعوری طور پر الفاظ کو اسی ماحول کے تناظر میں استعمال کرنے لگتا ہے یا پھر مختلف ماحول سے سابقہ پڑنے پر اس کو نئے معنی پہنا دیتا ہے۔ اسی وجہ سے غالباً یہ مقولہ مشہور ہے ''لکل شاعر معجم''۔

حضور کے ایک سادہ سے معنی وہ ہے کہ روضہ پاک پر حاضری دینا اور چونکہ اقبال اس سعادت سے سرفراز نہ ہو سکے لیکن یہ (سرالفراق شاعر) اپنے تخیلات کی دنیا میں بارہا اس شرف سے شرفیاب ہو چکا لہٰذا اسی طرح کی ساری نظمیں اسکا مصداق ہو سکتی ہیں اور حضور کے ایک معنی وہ ہیں جو اقبال نے اپنی شاعری میں استعمال کئے ہیں یعنی تعلق و وابستگی کا وہ عاشقانہ کیف جو انسان کو نظر تو نہ آئے لیکن انسان کے ہر قول و فعل اور حرکات و سکنات پر اسکی نمود ہو۔ مثلاً اقبال کہتا ہے۔

تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے عقل وغیاب وجستجو، عشق وحضور واضطراب

عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے ام الکتاب

یہ حضوری یا احساسی کیفیت ہی وہ دوا ہے جو انسانیت کش جراثیم کا خاتمہ کر سکتی ہے جو ہر انسان کے اندرون میں پیدا ہوتے ہیں اور جن کے طاقتور ہونے کی بنا پر ماضی بعید میں نئے نبی کی ضرورت پیش آتی تھی اور اب کسی مجدد کی۔ اور اس سلسلے میں محسن انسانیت کا یہ استثنا ہے کہ آپ نے اپنے احساسِ عبدیت سے، جس سے اونچا بقولِ اقبالؒ کوئی مقام نہیں، بدی کی اس طاقت کو اتنا کچلا کہ ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے آپ ﷺ سے پوچھا ''امعک شیطان''؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: نعم ولکنہ اسلم۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے آپ ﷺ کی زندگی کو نبوت کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ صرف یہ ہی نہیں بلکہ رب ذوالجلال کو آپ ﷺ کی زندگی کی یہ ادا اتنی پسند آئی بقول علامہ اقبالؒ ؎

پھڑک اٹھا کوئی تیری ادائے ماعرفنا پر

تیرا رتبہ رہا بڑھ چڑھ کر سب ناز آفرینوں میں

اور پھر اللہ نے آپ کی زندگی کی اتباع اور پیروی لازم وضروری قرار دے دی ہر اس فرد بشر پر جو اپنے اندر محبوبیت کی شان پیدا کرنا چاہتا ہے: قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ'' اسی مفہوم کو علامہ اقبالؒ نے کچھ اس طرح ادا کیا ہے: ؎

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز کیا ہے، لوح وقلم تیرے ہیں

پھر جو انسان اس مبارک زندگی سے جتنا قریب جا سکا اس کے اندر اسی قدر محبوبیت، جاذبیت، تاثیر اور دلکشی پیدا ہوتی چلی گئی۔ دعوت وعزیمت کی پوری تاریخ اس صداقت پر گواہ ہے۔ سیدنا ابوبکرؓ اس گلستان کے سرسبد ہیں، جس کی زندگی کی ترجمانی کرتے ہوئے علامہ قبالؒ کہتے ہیں۔ ؎

پروانے کو چراغ ہے، بلبل کو پھول بس

صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسول بس

علامہ اقبالؒ چونکہ نرے شاعر ہی نہ تھے ؎

دل نہیں شاعر کا، ہے کیفیتوں کی رستخیز
کیا خبر تجھ کو، درونِ سینہ کیا رکھتا ہوں

بلکہ وہ پیغمبرانہ فکر اور داعیانہ دل رکھتے تھے۔ اس لیے وہ مجھے اور آپ کو اس جوہر کی حامل شخصیات ،جن کو وہ فقیروں سے تعبیر کرتے ہیں، کی صحبت میں بیٹھنے کی تلقین کرتے ہیں

جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو موجِ نفس ان کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہل دل کے سینوں میں
تمنا درد دل ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

محمد مصطفیٰ ﷺ کی کی پُرنور زندگی کا یہ ایک انوکھا پہلو ہے کہ آپ ﷺ کو گرم و سرد حالات میں بھی اپنے اس رشتہ عبدیت سے لمحے بھر کے لیے بھی ذہول نہیں ہوا جو آپ کو اپنے خالق و مالک کے ساتھ تھا چنانچہ مایوس کن حالات میں بھی آپ ﷺ کی باتوں میں پہاڑ کی استقامت نظر آتی ہے۔ ابو طالب کی مجلس میں قریش کے بڑے بڑے لوگوں کی موجودگی میں جب ابو طالب قریش کے دباؤ میں اپنے بھتیجے سے لچک دکھانے کی فرمائش کرتا ہے تو حضرت محمد ﷺ فرماتے ہیں "یا عم ، کلمة واحده تعطونها تملکون العرب و تدين لكم بها العجم" بقول اقبالؒ

رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا
اتر گیا جو تیرے دل میں لاشریک لہ

اور یہی محمد ﷺ ان مقامات پر جہاں دیگر اس ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہیں جس کو قرآن نے اپنے ان بلیغانہ الفاظ میں واضح فرمایا کہ "ان الملوک اذا دخلوا قریتہ افسدوھا وجعلوا اعزة اهلها اذلة" جس کو ڈاکٹر اقبالؒ نے یوں تعبیر کیا:

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرت انسان کی قبا چاک

محمد ﷺ انتہائی متوضعانہ شان یہ میں اعلان کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں (الیوم یوم

الرحمۃ (۲) خیارھم فی الجاھلیۃ خیارھم فی الاسلام (۳) خذھا خالدۃ تالدۃ) اسی طرح کے مواقع پر اقبال کا یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے ۔

یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر
مگر ہر کہیں بے چگوں بے نظیر

وہ وحدت ہے یہاں، وہ رشتۂ عبدیت جس کی تلقین ہر نو مسلم کو سب سے پہلے کی جاتی ہے تاکہ عمر بھر کے لیے اس ملت کی اساس اس کے قلب و ذہن کی لوح پر اسی طرح منقش رہے کہ وہ مٹائے نہ مٹے بلکہ ہر وقت تازہ دم رہے۔ آپ ﷺ کے اس رشتے کی انفرادیت کو شاعر مشرق یوں سلام پیش کرتے ہیں ۔

عبد دیگر عبدہ چیزے دیگر
ما سراپا انتظار و منتظر
عبدہ دہر است و دہر از عبدہ است
ما ہمہ رنگیم او بے رنگ و بو است
عبدہ چند و چگوں کائنات
عبدہ رازِ درونِ کائنات

یہ ایک حقیقت ہے کہ اقبالؒ ۱۸۹۱ تک کسی گل کی تلاش میں تھے، لیکن یہ عجب اتفاق ہے کہ طوفان مغرب میں انہیں یہ گل ہاتھ آیا چنانچہ کہتے ہیں۔

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے
خوبیِ قسمت سے آخر مل گیا وہ گل مجھے

وہ گل تھا عشق نبی ﷺ جس کو انھوں نے علم الیقین کے درجے میں دریافت کر لیا تھا اور جو چیز علم الیقین کے درجے میں کسی کو حاصل ہوتی ہے، تو اس کی وہ کیفیت ہو جاتی ہے، جس کو علامہ نے اس شعر میں آشکارا کیا ہے ۔

شمع کی طرح جئیں بزم گہ عالم میں
خود جلیں دیدہ اغیار کو بینا کر دیں

اور خود اقبال کی اپنی زندگی جس کے مصداق بنی رہی جس کا کچھ نہ کچھ اندازہ ان کے عشق و جذب میں ڈوبے ہوئے نعتیہ کلام میں سے مندرجہ ذیل چند ایک اشعار سے لگایا جا سکتا ہے جن سے ان کی سرگرمیوں کا رُخ صاف عیاں ہے ؎

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہ دانش فرنگ — سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف
کرم اے شہہ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظر کرم — وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغ سکندری
در دل مسلم مقام مصطفیٰ است — آبروئے ما ز نام مصطفیٰ است
مصطفیٰ برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست — اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است
اوروں کو دیں حضور، یہ پیغام زندگی! — میں موت ڈھونڈتا ہوں زمین حجاز میں
وہ زمین ہے تو اے خواب خواہ گاہ مصطفیٰ — دید ہے کعبہ کو تیری حج اکبر کے سوا
سالار کارواں ہے میر حجاز اپنا — اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا
اقبال کس کے عشق کا یہ فیض عام ہے — رومی فنا ہوا حبشی کو دوام ہے
ہوا ہو ایسی کہ ہندوستان سے اے اقبال — اڑا کے مجھ کو غبارِ راہ حجاز کرے
قوت عشق سے ہر پستی کو بالا کر دے — دہر میں اسم محمد سے اُجالا کر دے
سراپا حسن بن جاتا ہے جس کے حسن کا عاشق — بھلا اے دل حسین ایسا بھی ہے کوئی حسینوں میں

یورپ سے واپسی پر اقبال نے عشق نبی ﷺ کی آگ کو اس قوت و شدت سے روشن کیا کہ وطن پرستوں کے خیمے میں آگ لگ گئی اور وہ چلا اُٹھے، جس کا اندازہ ایک کشمیری پنڈت کی مندرجہ ذیل شعر سے لگایا جا سکتا ہے ؎

ہندی ہونے پر ناز جسے کل تھا حجازی بن بیٹھا
اپنی محفل کا رند پرانا آج نمازی بن بیٹھا

اقبال وہ زندہ جاوید شخصیت ہے جس پر اتنا کچھ لکھا گیا کہ اتنا کسی دوسری ادبی یا فنی شخصیت پر نہیں لکھا گیا جیسے شیکسپیر یا ٹیگور: بقول اقبالیوں کے کہ دو ہزار سے زیادہ کتابوں پر مشتمل کتب خانہ اقبال پر وجود میں آ چکا ہے۔ اور ہنوز یہ سلسلہ شد و مد کے ساتھ جاری ہے اور خود ان کے حیات جاویداں پانے کی اصل وجہ بھی عشق نبوی ﷺ ہے جس کی برکت سے اس کے کلام میں وہ

خصائص پیدا ہوئے جنھوں نے ہمیشہ محققین اور علم دوست افراد کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے چنانچہ خود علامہ اقبالؔ کہتے ہیں:

جب سے آباد تیرا عشق ہوا سینے میں
نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینے میں

جستجو گل کی لئے پھرتی ہے اجزا میں مجھے
حسن بے پایاں ہے درد لا دوا رکھتا ہوں

خاک میں مل کر حیات ابدی پا جاؤں
عشق کا سوز زمانے کو دکھاتا جاؤں

اور زندگی جاویداں کا پیغام دیتے ہوئے اقبال کو سنیے

تو دار کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا ترجمان ہو جا
خودی میں ڈوب جا، غافل یہ سر زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام وسحر سے جاوداں ہو جا

علامہ اقبالؒ کا یہ عشق شعوری تھا کیوں کہ وہ ایک جہاں دیدہ شخصیت تھی جنہوں نے انسانیت کے کرم فرماؤں کی زندگیوں کا بڑا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق ومغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا، وہاں بے ذوق ہے صہبا

انہوں نے پایا کہ سائنس داں ہوں کہ فلسفی، شعراء ہوں کہ فاتحین سبھوں نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ انسانیت کے خادم ہے، لیکن تاریخ نے یہ ثابت کر دکھایا کہ ان میں سے کسی کی خدمت کا معیار ان بلندیوں کو چھو بھی نہیں سکتا ہے جن بلندیوں تک محسن انسانیت کی رسائی تھی۔ اپنے تو اپنے غیروں نے بھی آپ کے اس تاریخی کردار کو تسلیم کیا کہ آپ ﷺ کے نتیجے میں آنے والے انقلاب نے انسانی تاریخ کا رُخ بدل دیا۔ چنانچہ ایک عیسائی مقالہ نگار لکھتا ہے:

"its advent changed the course of human history"

جس کی پشت پر آپ ﷺ کا وہ حکیمانہ اصول ہے جس میں آپ ﷺ سماجی روایات کو توڑے بغیر اصلاح وتبلیغ کے مشن کو شروع کرتے ہیں اور جس میں اولیت انسانیت کے داخلی اور اندرونی پہلو کو حاصل ہوتی ہے جیسا کہ پکھتھال نے اپنے ترجمہ قرآن میں لکھا ہے کہ:

"Prophet progressed from in most things to outward things "

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ سماجی روایات پر صدیوں کی تاریخ کھڑی ہوتی ہے۔جیسا کہ کسی نے بجا کہا:

"It requires a lot of history to make a little tradition"

اوراس کے اچھے یا حساس پہلو کو نظر انداز کرتے ہوئے تبدیلی لانے کی بات کرنا تعمیر کی نہیں ،بلکہ تخریب کی دعوت ہے اس لیے آپ ﷺ نے اپنا کام اس اصول کے مطابق شروع کیا انما بعثت الاتمم مکارم الاخلاق ،اورلو دعیت الی حلف الفضول فی الجاھلیة لا جبت ''نیز فرمان الٰہی (اولئک الذین ھدی اللہ فبھدٰی ھم اقتدہ) اور شاید اسی حکمت کے پیش نظر آپ ﷺ نے کعبہ کی تعمیر نو جیسی شدید خواہش کو ترک کر دیا۔

علامہ اقبالؒ کے ذہن وفکر پر امت مسلمہ کے حوالے سے جو بہت سارے مسائل سوار تھے ان میں ایک اہم مسئلہ فقہ اسلامی کی تدوین جدید ہے۔اس ضرورت کا احساس انہیں کتنا تھا اس کا اندازہ ان کے خطوط سے لگایا جا سکتا ہے، جو انہوں نے سید سلیمان ندویؒ کے نام تحریر کئے ہیں۔ اور خود انہوں نے اس حوالے سے بنیادی اصول وقواعد وضع بھی کئے تھے،جن پر وہ چاہتے تھے کہ جدید فقہ کی عمارت کھڑی ہو لیکن یہ انتہائی نازک مسئلہ تھا اور غالباً انھیں اندازہ تھا کہ ایک دفعہ یہ دروازہ کھل گیا اور اس کے لیے درکار شرائط کا لحاظ نہ رکھا گیا اور کم نظر علماء کے ہتھے چڑھ گیا تو امت انتشار وافتراق کا شکار ہو کر رہ جائے گی شاید اسی لیے انہوں نے رسول ﷺ کے مذکورہ طرز عمل کو اپناتے ہوئے اپنی کتاب ''رموز بے خودی'' میں دورِ انحطاط میں اجتہاد کے مقابلے میں تقلید کی دعوت دی ہے اقبالؒ کہتے ہیں

ز اجتہاد عالمانِ کم نظر   اقتداء بر رفتگاں محفوظ تر

عقل آبایت ہوس فرسودہ نیست   کارِ پاکاں از غرض آلودہ نیست

فکر شاں رسید ہے بارک تر   ورعِ شاں با مصطفیٰ نزدیک تر

محسن انسانیت کا سب سے بڑا احسان اولاً یہ ہے کہ آپ نے انسانیت کو علم صحیح کی دولت سے مالا ل کیا ثانیاً اس علم پر یقین کامل کی نعمت سے سرفراز فرمایا، جس کی بدولت اس علم کے مطابق عمل پر کھڑا ہونے کا وہ جذبہ پیدا ہوا، جس کے سچے واقعات اگر اگر مستند تاریخی ذرائع سے ہم تک نہ پہنچے ہوتے تو وہ ایک افسانہ

معلوم ہوتے لیکن صحیح مسلم میں درج" ماعز اسلمی " امراۃ غامدیہ "اور اس جیسے واقعات سے کون انکار کر سکتا ہے؟

پیغمبرِ اسلام ﷺ نے علم کی طرف پہلا قدم یہاں سے اُٹھایا کہ جس دنیا میں ہم بستے ہیں، اس کو کس نے بنایا۔ ہم اس دنیا میں جن نوع بنوع نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں ان کی تخلیق کا کیا مقصد ہے؟ اور خود ہماری تخلیق کیوں عمل میں لائی گئی؟ یہ ہیں وہ بنیادی سوالات جن کا تعلق ہر فرد انسانی سے ہے۔ پیغمبر انہیں حل کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہوا ہوتا ہے اور توحید کا وہ تصور انسانیت کو دیتا ہے ،جس کی برکت سے مظاہر پرستی میں جکڑی انسانیت آزاد ہوتی ہے اور راحت کا سانس لیتی ہے۔ بقول حالی ؔ

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی ہری ہوگئی ساری کھیتی خدا کی

اور پھر محمد عربی کے شاگردوں نے دنیا کو وہ نظارہ دیرینہ دکھادیا، جس کے دیکھنے کے اقبال ؒ متمنی تھے ۔

نظارۂ دیرینہ زمانہ کو دکھادے اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملادے

اقبال ؒ کی زبان نے جس کی تصویر کچھ اس طرح سے کھینچی ہے ۔

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر کہیں مسجود تھے پتھر، کہیں معبود شجر
خوگر پیکر محسوس تھی انسان کی نظر مانتا کوئی ان دیکھے خدا کو کیوں کر
تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام تیرا قوت بازوے مسلم نے کیا کام تیرا
نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے زیر خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے.
کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے منہ کے بل گر کے ھواللہ احد کہتے تھے

پھر اقبال پیغام کے اسلوب میں اس حقیقت کو یوں ادا کرتا ہے ۔

ہے اگر دیوانہ غائب تو کچھ پروا نہ کر منتظر رہ وادیٔ فاراں میں ہو کر خیمہ زن
عارضی ہے شانِ حاضر، سطوت غائب مدام اس صداقت کو محبت سے ہے ربط جان وتن
شعلۂ نمرود ہے روشن زمانے میں تو کیا شمع خود را می گداز د درمیاں انجمن

نور ما چوں آتش سنگ از نظر پنہاں خوش است

دوسرا احسان عظیم آپ ﷺ کا ہے مساوات بشر، آپ کا یہ وہ احسان ہے، جس سے اس

وقت کی متمدن وغیر متمدن دنیا نا آشنا تھی، مساوات کا یہ اصول ہمہ گیر تھا، یعنی علم کے حصول میں مساوات، آزادی اظہار رائے میں مساوات، قانون کے نفاذ میں مساوات، معاملات ومعاشرت میں مساوات، آج کے حقوق انسانی کے علمبرداروں کی طرح نہیں کہ کسی کو ویٹو حاصل ہے۔ کہیں تعلیمی جامعات کے کچھ خاص خاص شعبوں کے دروازے کچھ لوگوں کے لیے مقفل ہیں۔ مستزاد بقول حکیم الامت ؎

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ دانائی   پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات

وہاں فاطمہ بنت محمد ﷺ کے ہاتھ بھی کٹ سکتے ہیں اگر وہ چوری کے جرم میں خدانہ خواستہ ملوث پائی جاتی، وہاں رنگ ونسل کا کوئی سوال ہی نہیں، وہاں بلال کعبہ کی چھت پر بھی چڑھ سکتا ہے وہاں بڑا وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہو، قیامت اور محشر کے تصور سے کانپنے والا ہو، رحمت ہو خدا کی اقبال پر کہ اس نے کس خوبی سے محمد عربی ﷺ کے اس احسان کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

جس کا امین ازل سے ہوا سینہ بلال   محکوم اس صدا کے ہیں شاہنشہ وفقیر
ہوتا ہے جس سے اسود واحمر میں اختلاط   کرتی ہے جو غریب کو ہم پہلوئے امیر
ہے تازہ آج تک وہ نوائے جگر گداز   صدیوں سے سن رہا ہے جسے گوشِ چرخ پیر
اقبال کس کے عشق کا یہ فیض عام ہے   رومی فنا ہوا، حبشی کو دوام ہے

آپ ﷺ کا ایک بڑا احسان انسانیت پر یہ بھی ہے کہ دین ایک جامع وحدت قرار پایا یعنی دین و دنیا کا تضاد یکسر ختم ہو کر رہ گیا، جب آپ ﷺ نے فرمایا "انما الاعمال بالنیات" نیت کی اس اخلاقی اساس کی دریافت کے بعد دنیا کا بڑے سے بڑا عمل دین بن جاسکتا ہے۔ اسی طرح سے عظیم سے عظیم تر دینی عمل بھی اللہ کے حضور میں باعث عذاب ہوسکتا ہے، اگر اس کے پیچھے کارفرما جذبے اور ارادے کی سمت صحیح نہیں، خواہ وہ شہادت جیسا عظیم عمل ہی کیوں نہ ہو۔ (انا للہ لیؤید ھذا الذین بالرجل الفاجر) رسول اللہ ﷺ کے اس تاریخی کردار کی علامہ اقبالؒ نے بہترین تصویر کھینچی ہے ؎

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی   سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں   کہ وہ سربلندی اور یہ سربزیری

سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی امیری
ہوئی دین و دنیا کی جس دم جدائی ہوس کی امیری ہوس کی وزیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشین کا بشیری ہے آئینہ دار نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

رسول وحدت ﷺ نے ہمیں یہ حسب ذیل دعا سکھائی تا کہ ہمیں یہ سبق فراموش نہ ہو سکے، کہ مذہب نہیں سکھایا دنیا سے بیر رکھنا۔ (ربنا آتنا فی الدنیا حسنہ و فی الآخرۃ حسنہ وقنا عذاب النار)

آجکل یہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے کہ قانون کو کیسے موثر بنایا جائے تا کہ BOPEE جیسے سکنڈل ظہور پذیر نہ ہوں، لیکن محسن انسانیت نے جو قانون و شریعت عطا فرمائی، اس میں کبھی بھی اس طرح کا مسئلہ پیدا نہیں ہوا، وجہ اس کی یہ کہ موجودہ تہذیب جس کے شکنجے میں ہم پھنس چکے ہیں، چاہتی ہے کہ ہر چیز amoral ہونی چاہئے value nuteral ہونی چاہیے positive ہونی چاہئے، اسی طرح سے جب مذہبی اقدار، اخلاقی اساس اور روحانی روایات کو اجتماعی زندگی سے ایک دفعہ نکال پھینک دیا گیا تو پھر اس کے وہ نتائج پیدا ہو کر رہیں گے جو ہم عالمی سطح پر دیکھ رہے ہے بقولِ دانائے راز

بنیاد لرز جائے جو دیوار چمن کی ظاہر ہے کہ انجام گلستان کا ہے اغاز

قربان جاؤں محمد مصطفیٰ پر کہ آپ ﷺ نے اس سکتی بلکتی انسانیت کو جو قانون و شریعت دی ،اس کی عمارت انتہائی بلند و پاکیزہ روحانی و اخلاقی اساسات پر کھڑی ہے ۔قانون jurisprudence کی پوری تاریخ میں آپ ﷺ کی یہ منفرد خصوصیت ہے کہ آپ نے نہ صرف قانون دیا بلکہ قانون کے وہ اعلیٰ تصورات بھی دیئے جنہیں آج کل کی اصطلاح میں meta jurisprudence کہا جاتا ہے ،اور دس لاکھ مربع میل پر اس قانون کو کامیابی کے ساتھ چلا کر دکھایا بھی ،اور اسی اعتبار سے آپ ﷺ بنی نوع انسان کے مقنن اعظم ہیں اور آپ ﷺ کا عطا کردہ نظامِ حیات ایک معجزہ ہے۔ اقبال نے بڑے خوبصورت اسلوب میں اسلامی قانون و شریعت کی اس روحانی اساس کو یوں بیان کیا ہے

گرچہ تو زندانی اسباب ہے قلب کو لیکن ذرا آزاد رکھ

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ
اے مسلمان ہر گھڑی پیشِ نظر آیہ لایخلف اللہ المیعاد رکھ
یہ لسان العصر کا پیغام ہے ان وعد اللہ حق یاد رکھ

ایک دوسرے موقع پر اقبالؒ ایک سید زادے کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے۔

انجام خرد ہے بے حضوری ہے فلسفہ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت ہیں ذوق علم کے واسطے قوت
دین مسلک زندگی کی تقویم دین سر محمد و ابراہیم
دل در سخن محمدی بند اے پور علی زبو علی چند

شریعت محمدی ایسے زندہ عناصر پر مشتمل ہے، جس کی بنا پر ابلیسی نظام کو ہر وقت یہ خطرہ لگا رہتا ہے کہ کہیں وہ خصائص بندگانِ خدا پر آشکارا نہ ہو جائیں جن کی آشکارا ہوتے ہی اس کا یہ سارا نظام تحلیل ہو سکتا ہے۔ دیکھئے اقبال ابلیس کی اس خدشے کے اس ضمن میں اس کی چند خصوصیات کی طرف اشارہ کرتا ہے (۱) حقوق نسواں کا محافظ ہے (۲) عظمت انسانی کا اس میں لحاظ ہے (۳) اس میں مساوات ہے (۴) مالدار لوگ مال کے امین ہیں نہ مالک (۵) زمین اللہ کی ہے۔

عصر حاضر کے تقاضوں سے ہے لیکن خوف ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں
آئین پیغمبر سے سو بار الحذر حافظ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لیے نے کوئی فغفور خاقاں نے فقیر رہ نشین
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا ہے فکر و عمل کا انقلاب بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمین

دنیا کے اندر جو مختلف خیالات و رجحانات اور نظامہائے فکر و حیات ہیں ان میں سے اگر ابلیس کو کسی سے خطرہ لاحق ہے تو وہ ہے اسلام کا نظامِ حیات، بقول اقبالؒ

جانتا ہے جس پہ روشن باطن ایام ہے مزدکیت فتنہ فردا نہیں اسلام ہے

لیکن ظاہری بات ہے کہ کسی بھی نظام کو چلانے کے لیے افراد کی ضرورت ہوتی ہے، جو اس نظام کی نافعیت اور خیر کو روزِ روشن کی طرح واضح کریں اور عملاً اس دنیا کے سامنے سے پیش کریں

۔اس لیے کسی بھی نظام زندگی میں دو باتیں دیکھنی پڑتی ہیں۔اس کا فکری ونظری پہلو اور اس کے حاملین کی اس کے ساتھ وابستگی۔

دیگر نظامہائے زندگی کو اگر دنیا میں کچھ قوت وشوکت حاصل رہی ہے یا ہے تو وہ درحقیقت اس کے حاملین کی قوت شخصیت اور ان کی سچی، مستحکم اور مخلصانہ وابستگی کی بنا پر تھی۔خود و نظامِ زندگی اپنے اندر وہ مضبوط فکری بنیاد نہیں رکھتا جس کی بنا پر وہ قائم رہ سکے جیسا کہ اشتراکیت کی تاریخ سے واضح ہے، اور اسی پہلو سے علامہ اقبالؒ نے مغربی نظامِ زندگی پر پُر زور تنقید کی ہے ۔

وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اس کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

کیوں کہ علامہ اقبالؒ کے یہاں یہ تہذیب مندرجہ ذیل اسباب پر مبنی ہے ۔

فسادِ قلب ونظر ہے فرنگ کی تہذیب — کہ روح اس مدنیت کی نہ رہ سکی عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید — ضمیر پاک وخیال بلند وذوق لطیف
میخانۂ یورپ کے دستور نرالے ہیں — لاتے ہیں سرورِ اول، دیتے ہیں شراب آخر

اور اس تہذیب کے آثارِ بد اقبالؒ کی زبان میں حسبِ ذیل شکلوں میں ظاہر ہو چکے ہیں ۔

بیکاری وعریانی میخواری وافلاس — کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا — سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگ مفاجات

اس لیے:

پیر میخانہ یہ کہتا ہے کہ ایوان فرنگ — سست بنیاد بھی ہے آئینہ دیوار بھی ہے

رہی بات اسلام کی، تو اس کا فکری اور نظری پہلو اپنی پاکیزگی، طہارت اور جامعیت میں اتنا واضح، روشن اور فائق ہے کہ مذاہب وادیان کی پوری علمی تاریخ اس سچائی پر شاہد عادل ہے ۔اس پر جب بھی تنقیدی نظریں اُٹھتی ہیں تو وہ اس کے حاملین کی عدم وابستگی یا غلط ترجمانی کے نتائج ہیں۔اقبالؒ کہتے ہیں کہ دشمنان اسلام کا یہ ایک حربہ اور سازش ہے کہ حاملین اسلام کو ثانوی قسم کی باتوں میں الجھائے رکھا جائے، تا کہ ان کی رسائی اس چشمۂ صافی تک نہ ہو سکے، جس سے اگر انہیں صحیح طور پر سیراب ہونے کا موقع مل گیا تو اس کے سارے ابلیسی نظام کی دھجیاں اڑ جائیں گی لہٰذا اس

کی پوری سعی و کوشش اس کے لیے وقف ہے کہ کسی بھی طرح ان کے اندر وہ خواہش ہی پیدا ہونے نہ پائے، جس کے پیدا ہوتے ہی یہ مناظر دیکھے جا سکتے ہیں۔

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات
ہو نہ روشن اس کی تاریک رات

شعلہ بن کے پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو
خوف باطل کیا ہے کہ غارت گر باطل بھی تو

پھونک ڈالے یہ زمین و آسماں مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

اقبال کو یقین ہے کہ مسلم قوم کے اندر یہ صلاحیت ابھی بھی موجود ہے اور اسلام کے سچے حاملین کی قلیل جماعت بھی موجود ہے چنانچہ وہ ابلیس کی ترجمانی میں کہتا ہے۔

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
اس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

نال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشک سحر گاہی سے جو ظالم وضو

ابلیس اپنے کارندوں کو اسلام کے ساتھ مسلمانوں کی وابستگی اور رشتے کو توڑنے کی وصیت کرتے ہوئے کہتا ہے۔

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی پہ اس کے سب مہرے ہوں مات

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جسکے دین کی احتساب کائنات

اس صورتحال کو کہ:

چشم عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئین تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقین

برقرار رکھنے کے لیے جو جو حربے کارگر ہو سکتے ہیں، ان کو آزمانے کی ہدایت دیتے ہوئے ابلیس اپنے حواریوں سے مخاطب ہے۔

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہاں بے ثبات

ہے وہی تصوف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

اس کے باوجود یہ رجائی شاعر کہتا ہے اگر طلب صادق ہو تو انسان منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔

ہے آبِ حیات اسی جہاں میں
شرط اس کے لیے تشنہ کامی

غیرت ہے طریقتِ حقیقی
غیرت سے ہے فقر کی تمامی

دوسری جگہ بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے اقبال کہتا ہے ؎

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر — جس فقر کی اصل ہے حجازی

نبی اکرم ﷺ کا یہ عجیب کارنامہ ہے کہ آپ نے انسانوں کی ایک ایسی ٹیم تیار کی، جنکی زندگیاں اتنی تابندہ ہیں، ہر دور کا مجدد جن کے نقوش پر چل کر ملتِ اسلامیہ کی مادی وروحانی علمی وعملی نشاۃ ثانیہ کے لیے رہنما خطوط وضع کرسکتا ہے (اصحابی کالنجوم فبایھم اقتدیتم اھتدیتم) کی نبوی سند کے پیشِ نظر مجددِ ملت علامہ اقبال نے جن کی طرزِ زندگی کو دیکھ کر اپنے دور کے مطلوبہ انسان کا استخراج کیا۔ اقبال کے مردِ مومن کی یہ مطلوبہ صفات، صحابہ کرام کی عملی زندگی تھی، جس کی وجہ سے وہ ساری دنیا پر چھا گئے۔ اور یہ سب آپ ﷺ کی نظرِ کرم کا فیض تھا اور تربیت شاقہ کا نتیجہ ؎

جہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی — مرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک
ترے صید زبوں فرشتہ وحور — کہ شاہین شاہِ لولاک ہے تو

دنیا آج تک انگشت بدنداں ہے کہ انہوں نے اتنی سرعت کے ساتھ اس حجازی تہذیب کو کیسے غالب کردیا اور دنیا والے اس انقلاب کی عجیب وغریب مادی تاویلیں پیش کرتے ہیں اور وہ اس اہم حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ لذت آشنائی ایک عجب چیز ہے جو معجزے دکھلاتی ہے ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ — غالب وکار آفریں، کار کشا کار ساز

ملاحظہ ہو اس شوق وذوق کی ایک مثال جو نبی ﷺ کے ایک پروردہ محبت پر طاری ہوتا ہے معلمِ انسانیت کے دیدار کے لیے اور یوں گویا ہوتا وہ امیر لشکر سے ؎

اے بوعبیدہ رخصت پیکار سے مجھے — لبریز ہوگیا مرے صبر وسکون کا جام
بے تاب ہو رہا ہوں فراق رسول میں — اک دم کی زندگی بھی محبت میں ہے حرام
جاتا ہوں میں حضورِ رسالت ﷺ پناہ میں — لے جاؤں کا خوشی سے اگر ہو کوئی پیام
بولا امیرِ فوج کہ وہ نوجوان ہے تو — پیروں پہ تیرے عشق کا واجب ہے احترام
پوری کرے خدائے محمد تیری مراد — کتنا بلند تیری محبت کا ہے مقام
پہنچے جو بارگاہِ رسول امیں میں — تو کرنا عرض میری طرف سے سلام
ہم پر کرم کیا ہے خدائے غیور نے — پورے ہوئے جو وعدے کئے تھے حضور نے

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ سے محبت امتِ اسلامیہ کے ہر فرد کی رگ رگ میں رواں دواں ہے، جس کو کھینچ باہر پھینک دینے کے لیے مختلف ذرائع استعمال کئے جاتے ہیں کہیں گستاخانہ کارٹون نشر ہوتے ہیں اور کبھی گستاخانہ فلمیں منظرِ عام پر لائی جاتی ہیں وغیرہ وغیرہ تاکہ وہ جذبہ جو آپ ﷺ کی تئیں مسلمانوں کے دلوں میں ہے ٹھنڈا پڑ جائے۔ کیوں کہ برائی جب بار بار ہوتی ہے تو پھر لوگوں کی نظر میں وہ برائی نہیں رہتی، ملاحظہ ہو ابلیسی پلان'' اقبال کی زبان میں ۔

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمد ﷺ اس کے بدن سے نکال دو

محبت وعقیدت کے اس خوابیدہ عنصر جو آپ کی گستاخی کے موقع پر ایک مسلمان کو جان کا نذرانہ پیش کرنے پر آمادہ کر لیتا ہے۔ اقبال اسی عنصر کو مسلمانوں کی روزمرہ کی زندگی میں متحرک دیکھنا چاہتے ہیں اور ان کا سارا پیام مختلف طریقوں اور ناموں سے اسی محور پر گھومتا ہے اور اقبال کے یہاں مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بحالی کا یہی ایک واحد حل ہے: ۔

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اقبالؒ نے عشق نبوی کو ایک زندہ قوت کی حیثیت سے اپنی شاعری کا مسلک بنالیا تھا اور اس میں ان کی وہ کیفیت ہوگئی جس کو انھوں نے خود تعبیر کیا ہے: ۔

لطف مرنے میں باقی، نہ مزہ جینے میں
کچھ مزا ہے تو یہی خونِ جگر پینے میں
پھونک ڈالا ہے میری آتش نوائی نے مجھے
اور میری زندگانی کا یہی سامان بھی ہے

آخرِ کار عشق میں ترقی کرتے کرتے وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ براہِ راست حضور ﷺ کو خطاب کرتا ہے، جہاں ابلیس روحِ محمد کو امت سے نکالنے کی بات اس طرح کرتا ہے کہ 'روح محمد ﷺ کو مسلمان کے بدن سے نکال دو' وہاں اقبال اسی روحِ محمد ﷺ کو مخاطب بنا کر

یوں شکوہ کرتا ہے ۔

شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے!
ہر چند ہے بے قافلہ و راحلہ و زار
اس کوہ و بیاں سے حدی خواں کدھر جائے
اس راز کو فاش کرائے روحِ محمدی
آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

ایک موقع پر اقبال محسن انسانیت کے حضور میں کھڑے یہ فریاد کرتا دکھائی دیتا ہے ۔

تو اے مولائے یثرب! آپ میری چارہ سازی کر
میری دانش ہے افرنگی میرا ایمان ہے زناری

اور یہ عشق نبی کا مظہر ہی تو ہے کہ لوگوں میں جب یہ چرچا ہوتا ہے کہ اقبال محمد ﷺ کا مخبر و جاسوس ہے تو اقبال کے دل میں سرور و شادمانی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو سعدی و حالی کا وہ مکالمہ جس میں حالی نے جدید تعلیم کے نتیجے میں برصغیر کے نوجوان پر پڑنے والے اثرات کا تذکرہ کچھ اس طرح کیا ہے:

جب پیرِ فلک نے ورق ایام کا الٹا
آئی یہ صدا، پاؤ گے تعلیم سے اعزاز
آیا ہے اس سے عقیدوں میں تزلزل
دینا تو ملی، طائر دین کر گیا پرواز
پانی نہ ملا زمزمِ ملت سے جو اس کو
پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز
یہ ذکر حضورِ شہِ یثرب میں نہ کرنا
سمجھیں نہ کہیں ہند کے مسلم مجھے غماز

عشق کا یہ مسافر آخر کار اپنی مطلوبہ منزل پر پہنچ ہی جاتا ہے جس میں:

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر

کرتے خطاب آخر، اٹھتے حجاب آخر

ملاحظہ ہو اقبالؒ کے ان عاشقانہ نالوں کی ایک جھلک جس میں آپ دیکھ سکتے ہیں حجاب اُٹھتا ہوا، خطاب ہوتا ہوا اور جواب آتا ہوا۔

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامہ زمانہ ہوا
جہاں سے باندھ کے رختِ سفر روانہ ہوا
فرشتہ بزمِ رسالتؐ میں لے گئے مجھ کو
حضورِ آیہ رحمت میں لے گئے مجھ کو
کہا حضور نے، اے عندلیب باغِ حجاز!
کلی کلی ہے تیری گرمی نوا سے گداز
نکل کے باغ جہاں سے برنگ بو آیا
ہمارے واسطے تحفہ لے کے تو آیا
حضور! دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ وگل ہیں ریاض ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے، جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

اور اس عشق نبوی کا مسک الختام اقبال کا وہ فارسی شعر ہے جس میں وہ اللہ کو مخاطب بناتے ہوئے کہتے ہے ۔

تو باش ایں و با خاصان نیامیز
کہ من دارم ہوئے منزلِ دوست

کلام اقبال کے ناقدین اقبال کے عشق نبوی کی منتہائے کمال اس شعر کو بناتے ہیں جس میں وہ اللہ سے نبی کریم ﷺ سے دور اپنا حساب لینے کی بات کرتے ہیں۔

مکن رسوا حضور خواجہ مارا
حساب من زچشم اونہاں گیر

لیکن میرے دل میں خلش رہی کہ کیا اقبال کے عشق نبوی کا یہ گل مرجھانے تو نہیں لگا جو وہ اس طرح کی درخواست کر بیٹھے، اور یہ ایسی بات ہوئی کہ ع

گر گئے سجدے میں جب وقت قیام آیا

ان کا کلام بتاتا ہے کہ وہ اس کی خوشبو ہر وقت محسوس کرتے تھے اور جس میں اس کا حال اس شعر کا مصداق ہو کر رہ گیا۔

محبت میں ایسا وقت بھی آتا ہے انسان پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگ جان پر

اور جس کا ترجمان ان کا یہ شعر ہے۔

مجھے وہ درس افرنگ آج یاد آتے ہیں
کہاں حضور کی لذت، کہاں حجاب دلیل

تو پھر اس طرح کی درخواست کے کیا معنی ہیں تو کیا دیکھتا کہ۔

فرشتے بزم اقبال میں لے گئے مجھ کو
حضور عاشق نبوت میں لے گئے مجھ کو
کہی میں نے وہ بات اسے جو نہاں تھی میرے خانہ دل میں
گویا ہوا وہ رازدارِ مصطفےٰ، رقعہ تھما کر میرے ہاتھ میں
مثل سراب ہے اعتراض ترا
غور سے پڑھ یہ کلام مرا

پھڑک اٹھا کوئی تیری ادائے ما عرفنا پر
ترا رتبہ رہا بڑھ چڑھ کر سب ناز آفرینوں میں
رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے

☆

ادبِ اسلامی

شہر آشوب

خالق پرویزؔ (بارہمولہ)

یادِ ماضی کو دِلا! کچھ ساز دے
عہدِ رفتہ کو ذرا آواز دے

اُس زمانے کی سنا کچھ داستان
مہرباں مسلم پہ تھا جب آسماں

اُمّتِ خیرالامم کی بات کر
شہرۂ اسلاف کی کچھ بات کر

کیسے وہ دنیا میں تھے صاحب قراں
رزم گاہِ دہر کے شیرِ ژیاں

بن کے وہ بادِ صبا جس جا گئے
ساتھ سینوں کے لگا قرآں گئے

وہ فقط قرآن کا اعجاز تھا
سرنگوں دنیائے دوں کا باز تھا

جان لی دنیا نے پھر حقّانیت
یاد آیا معنیٔ لفظِ الست

تھا ھواللہ ھو فقط وردِ زباں
بن گیا توحید سب کا حرزِ جاں

مستیٔ تحمید تھی توحید سے
شرف تھا توحید کی تجدید سے

وہ سراپا نور تھے، ہم نار ہیں
وہ سدا مغفور تھے، ہم خوار ہیں

اب کہاں باقی رہے وہ باکمال
تھا مقدّر میں نہیں جن کے زوال

آخرش ہے ہر کمالِ را زوال
منطقی انجام کو پہنچا مآل

اوڑھ لی قسمت نے بالا آخر نقاب
چھپ گیا مسلم کا روئے آفتاب

دور جب وہ ہو گئے قرآن سے
چھٹ گیا پھر واسطہ یزدان سے

راغبِ دنیا کے خوگر ہو گئے
عیش وعشرت میں تونگر ہو گئے

وہ اسیرِ زلفِ دنیا ہو گئے
مستِ دنیا ما و فیہا ہو گئے

تھا یہی اعمال کا نعم البدل
نام اُن کا کھا گیا شکمِ اجل

اب کہیں باقی نہ تھیں رعنائیاں
ساتھ اُن کے رہ گئیں رسوائیاں

مِٹ گئے حرفِ غلط کے طور پر
رو رہے تھے لوگ اُن کے گور پر

تیر، تبر و تیغ نے تھی اب کمان
رہ گئی باقی مگر اک داستان

اے محمدؐ آپؐ پر لاکھوں سلام
باخدا ہو دہر میں خیرالانام

رُتبہ و عظمت میں ہو اعلیٰ ترین
ہر کسی مخلوق سے بالاترین

آپؐ کی آمد نشاطِ کائنات
آپؐ کی بعثت نویدِ صد نشاط

لوٹ آئی اس طرح سے زندگی
تیرگی سے جس طرح تابندگی

وادیٔ فاران دیکھا.....نور تھا
جیسے انوارِ تجلی طُور تھا

سطوتِ باطل کے سارے بام و در
گر گئے تھے یک قلم سب ٹوٹ کر

سازِ کہنہ جل گئے سب آگ میں
اب نیا سُر تال تھا ہر راگ میں

اس نئے سُر تال کا سوز و سرود
بن گیا وہ باعثِ آدم نمود

فخر فخری آپؐ کا ہی پایہ ہے
اس جہاں کے واسطے سرمایہ ہے

کہہ اُٹھے جن و ملک سب یک زباں
"تُو صلواۃِ صبح تُو بانگِ اذاں"

آپؐ سے پہلے عجب یہ حال تھا
یہ جہاں نظروں کا مایا جال تھا

تھا اگر موجود کچھ، نابود تھا
ہر طرف چھایا ہوا بس دود تھا

جا بجا تھا عالمِ فسق و فجور
ظرفِ انساں ہو گیا تھا چُور چُور

طینتِ انسان تھی یوں بے لگام
سرکشی، جور و جفا تھا گام گام

بھیڑ بکری کی طرح انسان تھے
سرکشوں کے سامنے حیوان تھے

بِک رہے تھے کوچہ و بازار میں
با مثالِ جانور سنسار میں

قعرِ ظلمت میں سدا تھے وہ غلام
جیسے طائر پھڑ پھڑاتے زیرِ دام

وہ اگر جور و جفا سے خستہ تھے
ہاں مگر اس حال میں لب بستہ تھے

آپؐ کے صدقے ہوئے آزاد وہ
اسوۂ احمدؐ سے تھے اب شاد وہ

مِٹ گیا سب امتیازِ رنگ و بو
اب نہ باقی تھی تمیزِ من و تو

گِر گئے نام و نسب کے بُت تمام
ایک صف میں آ گئے باہم تمام

تھا نہ اب شانِ فخر قوم کا
نے سفید و نے سیہ جرثوم کا

تھا فقط تقویٰ نشانِ امتیاز
اب نہ تھا محمود کوئی نے ایاز

عصبیت کی جڑ ہوئی جب کھوکھلی
وحدتِ انسانیت پھولی پھلی

آپؐ ہی سے ہے مسلماں کو ثبات
آپؐ سے تابندہ ہے یہ کائنات

دور ہیں اب آپؐ کے فرمود سے
لاتعلق بھی ہیں ہست و بود سے

بات ہے اب آج سب بگڑی ہوئی
چار سو ہے اب ہوا اُکھڑی ہوئی

دشمنِ اسلام ہے اغیار بھی
اور خود ہیں برسرِ پیکار بھی

ہیں اگر تعداد میں ہم بے شمار
ہے مگر حاصل نہیں کوئی وقار

نے لحاظِ وحدتِ اسلام ہے
نے فروغِ دین سے کچھ کام ہے

مسلکوں کا جا بجا ہے اہتمام
ہر کسی کو ہے الگ اپنا امام

ہیں جہاں میں گر بہت فرماں روا
نام بھی لیتے ہیں وہ اسلام کا

سام کے ہاتھوں کے ہیں نخچیر سب
یوں تو ہیں وہ لیس باشمشیر سب

ہے نہیں کچھ واسطہ اسلام سے
واسطہ اُن کو فقط ہے سام سے

کر رہے ہیں سب وہی کہتا ہے سام
بن گیا ہے آج وہ سب کا امام

ہے نظر میں سب کو امریکی مفاد
ہے بپا جس سے یہاں شر و فساد

گر گئے گویا ہیں اونچے بام سے
اس طرح اب ہم گئے ہیں کام سے

ہو کوئی مسلم حکومت یا فرد
نام ہم کو پڑ گیا دہشت گرد

تنگ اب وسعت زمیں کی ہو گئی
در بدر قسمت ہماری ہو گئی

نام کے اب ہم مسلماں رہ گئے
دہر میں ہم چشمِ حیراں رہ گئے

اب یہی ہے آرزو ربِّ کریم
ابرِ رحمت کی چلے تھوڑی نسیم

وہ گھٹا آئے سرِ فاران سے
یا اُٹھے پھر عالمِ امکان سے

کُھل کے برسے عالمِ اسلام پر
لوٹ آئے پھر وہ اپنے بام پر

آہِ سحرگاہی

از آسی غلام نبی

نفس نے غلط راہ پہ ہم کو لگایا
سدا عمر کو ہم نے یوں ہی گنوایا
ہماری یہ حالت بدل دے خدایا
ہماری یہ حالت بدل دے خدایا

تیرے خاص بندوں نے ہم کو ڈرایا
سدا ہم نے ان کو بہت ہی ستایا
مگر ہم نے ان کو نہ خاطر میں لایا
ہماری یہ حالت بدل دے خدایا

عقائد میں ہر سو تزلزل ہے ظاہر
یہ سب رنگ تہذیب حاضر نے لایا
جوانانِ ملت ہیں قابو سے باہر
ہماری یہ حالت بدل دے خدایا

کسی نے یہ سوشل کا جھنڈا سجایا
کسی کے ذہن پر ہے کیپٹل ہی چھایا
کسی نے سیکولر کا ڈنکا بجایا
ہماری یہ حالت بدل دے خدایا

صحابہؓ کی راہ سے بھی ہم ہٹ گئے ہیں
عداوت کا نشہ ہے ذہنوں پہ چھایا
مسلمان خانوں میں اب بٹ گئے ہیں
ہماری یہ حالت بدل دے خدایا

کوئی نوچتا ہے کوئی ٹوکتا ہے
عُدُوؤں نے از حد لہو بھی بہایا
کوئی راہِ حق سے ہمیں روکتا ہے
ہماری یہ حالت بدل دے خدایا

تباہی نے امت کو ہر سمت گھیرا
تیرا بحرِ رحمت عجب ہم نے پایا
تیرے بن نہیں اب ہے کوئی سہارا
ہماری یہ حالت بدل دے خدایا

گذشتہ عمر پہ نگاہ جب دوڑائی
تو لاتقنطو نے دلاسہ دلایا
خطاکاریاں سب نگاہوں میں آئیں
ہماری یہ حالت بدل دے خدایا

یہ امت خرافات میں کھوگئی ہے
نقش بھی انہیں کا دلوں پہ ہے چھایا
یہ غیروں کی یارب نظر ہوگئی ہے
ہماری یہ حالت بدل دے خدایا

قبر اور حشر کو بھی یکسر بھلایا — نہ خوفِ جہنم نے ہم کو رُلایا
دلوں پر ہے دنیا نے قبضہ جمایا — ہماری یہ حالت بدل دے خدایا
وہ مسجد جو بابر نے برسوں بنائی — تیرے پاک ناموں سے کافی سجائی
تو اس کو بھی چند ظالموں نے ڈھایا — ہماری یہ حالت بدل دے خدایا
نہ ذوقِ تلاوت نہ شوقِ عبادت — اداؤں سے ظاہر ہے کھلی بغاوت
یہ کرکٹ کا پھندا عجب راس آیا — ہماری یہ حالت بدل دے خدایا
سیاست کے نشے میں سب مبتلا ہیں — خدا کی قسم یہ عجب ابتلا ہے
شب و روز کا یہ وظیفہ بنایا — ہماری یہ حالت بدل دے خدایا

یَالَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْن

سارے عالم میں خدایا کیوں ہے مسلم سرنگوں
قلبِ مومن کی صدا یَالَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْن[1]
حامیانِ دین کا اب لٹ گیا صبر و سکون
قلبِ مومن کی صدا یَالَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْن

اَنْتُم الاعلون[2] کا جو مستحق تھا بالیقین
تنگ ہوئی اس پر خدائی مملکت کی سرزمین
نشہ ہے پھر بھی کہ ہم ہیں صاحبِ علم و فنون
قلبِ مومن کی صدا یَالَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْن

بے غرض بن کے خدائی بندگی ہے اب کہاں
بے طلب لوگوں سے ملنا اور جلنا ہے کہاں
مادیت کا ہی ہوا ہے ہر طرف سے اب جنون
قلبِ مومن کی صدا یَالَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْن

رب واحد کی پرستش کرنے والے تھے جو سب
بن کے بیگانوں کی مانند بٹ گئے خانوں میں اب
ہے نہیں ہرگز یہ امت کے لیے اچھا شگون
قلبِ مومن کی صدا یَالَیْتَ قَوْمِی یَعْلَمُوْن

منصبوں پر اب ہیں فائز خون پینے کے لیے
اور کماتے ہیں سبھی اب صرف جینے کے لیے
ایسی گھٹیا سوچ سے یہ بن گیا صید زبوں
قلبِ مومن کی صدا یَالَیْتَ قَوْمِی یَعْلَمُوْن

ہر گھڑی یہ رنگ رلیوں میں رہا کرتا ہے مست
اور اسی مستی نے اس کو کر دیا عالم میں پست
یاد ہی اس کو نہیں قل یآ اَیھاالکافرون
قلبِ مومن کی صدا یَالَیْتَ قَوْمِی یَعْلَمُوْن

یاد آسی کو کبھی آتا ہے جب خیر القرون
دل ہی اس کا آنِ واحد میں ہوا جاتا ہے خون
کوئی بھی یارب نہیں جس سے کہیں حالِ درون
قلبِ مومن کی صدا یَالَیْتَ قَوْمِی یَعْلَمُوْن

ا۔ یالیت قومی یعلمون سورہ یٰسین کی ایک آیت کا ٹکڑا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرد مومن کو جب کافروں نے شہید کیا تو قبر میں پہنچ کر اس نے چاہا کہ ان کافروں کو اس انعام واکرام کا کسی طرح پتہ چلے جو اللہ نے اسپر قبر میں کیے تا کہ وہ بھی اللہ پر ایمان لا کر اس کی بندگی کریں۔

۲۔ اسی طرح انتم الاعلون کا مفہوم یہ ہے کہ اے مومنو تم ہی سر بلند ہونگے اگر تم سچے مومن بن کر رہیں گے۔

[گذشتہ سے پیوستہ]

درس مثنوی

آسی غلام نبی وانی (سرپرست ماہنامہ راہِ نجات)

مکار یہودی وزیر نے کس طرح دینِ عیسیٰ میں تفرقہ پیدا کیا؟

عیسائیوں کے دین کے اندر تفرقہ پیدا کرنے سے پہلے جب مکار یہودی وزیر نے اپنے بادشاہ کے ذریعہ سے خوب رسوائی کرائی، تاکہ وہ عیسائیوں کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوجائے کہ اس کے ساتھ یہ معاملہ صرف عسائیت کو قبول کرنے کی وجہ سے کیا گیا اور انہوں نے اس کو سر آنکھوں پر جگہ دے دی لیکن اندر سے اس کے اور بادشاہ کے درمیان پیغامات جاری تھے۔ اور بادشاہ کو خفیہ طور سے اس کی طرف سے آرام واطمینان حاصل تھا بادشاہ بھی اس پر خفیہ طریقے سے اِصرار کرتا رہا کہ عیسائیوں کے اندر تفرقہ پیدا کر کے میرے دل کو راحت بخش دے۔ اس نے بادشاہ کو جواباً پیغام بھیجا کہ میں عیسائیوں میں رخنہ ڈالنے کے لیے کام میں لگا ہوں آپ ذرا صبر کیجیے اور دیکھئے اگے کیا ہوتا ہے۔

اس وقت عیسائیوں کے بارہ امیر [سردار] تھے اور عیسائیوں کا ہر ایک فرقہ ایک امیر کے تحت کام کرتا تھا۔ جب انھوں نے اس مکار یہودی وزیر کو اس مظلومانہ حالت میں دیکھا اور دین عیسیٰ کا فدوی سمجھا تو یہ بارہ قبیلے اور اُن کے سردار اس حاسد وزیر کے غلام بن گئے۔ سب اس پر بھروسہ کرنے لگے اور سب اس کی اقتداء میں مشغول ہوگئے۔ جب اس کمینہ یہودی وزیر نے سب کو قابو میں کرلیا تو اپنی مکاری اور چالاکی سے اُن میں بڑا فتنہ برپا کیا۔

ایک فرقہ کے لوگوں کے لیے یہ فرمان تحریر کیا کہ حقیقی توبہ کی حقیقت فقط یہ ہے کہ آدمی بھوکا

رہے اور ریاضت کرے اور اللہ کی طرف رجوع کرنے کے لیے یہ ایک ضروری شرط ہے۔ دوسرے فرقہ کے لوگوں کے لیے یہ تحریر کیا کہ ریاضت وغیرہ کرنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ البتہ خدا تک رسائی کے لیے سخاوت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔

تیسرے فرقہ کے لوگوں کے لیے یہ نصیحت تحریر کی کہ فاقہ کشی اور سخاوت پر بھروسہ کر کے خدا کی بارگاہ میں مقبول بننے کا تصور کرنا ایک قسم کا شرک ہے اور یہاں پہلی نصیحتوں کا تمسخر کیا۔

چوتھے طبقے کے لیے یہ تحریر کیا کہ توکل اور رضا کے علاوہ رضائے خدا کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا چاہیے۔

ایک نصیحت نامہ میں تحریر کیا کہ صرف توکل پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے۔ گویا عمل کو بے کار قرار دیا۔

ایک نصیحت نامہ میں یہ لکھا کہ یہ جو اللہ کی طرف سے کہا گیا ہے کہ فلاں کام کرو اور فلاں کام مت کرو یہ سب اس لیے ہیں کہ خدا بندہ کو یہ دکھا دے کہ تو کتنا عاجز ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جس قدر خدائی احکام ہیں وہ کرنے کے لیے نہیں بلکہ بندہ کو عجز تسلیم کرانے کے لیے ہیں۔ ان پر عمل ناممکن ہے لہٰذا بندہ اپنے آپ کو عاجز تسلیم کر لے۔ یہ جبر کی تعلیم ہے۔

ایک تحریر میں یہ نصیحت لکھی کہ اپنے عجز کو نہ دیکھ اس قسم کی سوچ خدا کے ساتھ احسان فراموشی ہے۔ اپنی قوت پر نظر رکھنی چاہیئے اور اپنی قدرت کو اللہ کا انعام سمجھنا چاہیئے۔ مطلب یہ کہ اپنے آپکو مجبورِ محض نہ سمجھو۔ ورنہ خدا کی عطا کردہ نعمت کا کفر ہوگا۔ انسان کی قدرت خدا کا عطیہ ہے، لہٰذا انسان قادر ہے اور اپنے اخلاق کا خود خالق ہے۔

غرض مختلف فرقوں کو مختلف ہدایات دیئے۔ ہر ایک بات دوسرے کی ضد تھی۔ جیسے زہر اور شکر ایک نہیں ہو سکتے ہیں اسی طرح یہ سب باتیں متضاد تھیں۔

مولانا فرماتے ہیں کہ یہ مکار وزیر بادشاہ کی طرح نادان اور غافل تھا جو خدائے بزرگ کے ساتھ پنجہ آزمائی کرتا تھا۔ اگرچہ بظاہر وہ عیسیٰؑ کے ماننے والوں میں پھوٹ اور اختلاف پیدا کرنا چاہتا تھا لیکن وہ اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ جس خدا کے دین میں وہ رخنہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا تھا وہ بڑا زبردست اور قدرت والا ہے اور اس کے ساتھ تعلق رکھنے والوں پر کوئی غالب نہیں آسکتا ہے۔ اب

مولانا چند اشعار میں اللہ کے خاص بندوں کی روحانی قوت کا بیان اس طرح کرتے ہیں ؎

صدا ہزاراں نیزۂ فرعون را ☆ در شکست آں موسیٰ با یک عصا

صدا ہزاراں طب جالینوس بود ☆ پیش عیسیٰؑ و دمش افسوس بود

صد ہزاراں دفتر اشعار بود ☆ پیش حرف اُمیش آں عار بود

(ترجمہ)

(۱) فرعون کے لاکھوں نیزے موسیٰؑ نے ایک لاٹھی سے توڑ دئے۔

(۲) جالینوس کی لاکھوں طبیں تھیں حضرت عیسیٰؑ اور اُن کی پھونک کے سامنے بیکار تھیں۔

(۳) اشعار کے لاکھوں دیوان تھے جو اُس کے اُمّی (محمد) کے کلام کے سامنے موجب ننگ تھے۔

(باقی آئندہ انشاء اللہ تعالیٰ)

[گذشتہ سے پیوستہ]

شرعی و فقہی اصطلاحات کی وضاحت سوال و جواب کی روشنی میں

آسی غلام نبی وانی (سرپرست ماہنامہ راہ نجات)

سوال:۔ اللہ تعالیٰ کے دیگر صفات کیا ہیں؟

جواب:۔ اس کی دوسری صفات میں سے ایک بڑی صفت یہ ہے کہ وہ قدیم ہے۔ اس جگہ قدیم کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سے ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ پہلے نہ تھا پھر پیدا ہو گیا۔ یہ مضمون قرآن میں اس طرح بیان ہوا ہے کہ ھو الاول والآخر یعنی وہ اللہ اوّلِ حقیقی ہے مطلب یہ کہ اس طرح ہمیشہ سے تھا جس کی کوئی ابتدا نہیں اور اسی طرح آخرِ حقیقی ہے کہ اس کے لیے کوئی انتہا نہیں۔ اگر اس کو ہمیشہ سے اور قدیم نہ مانا جائے بلکہ یہ کہا جائے کہ وہ پہلے نہیں تھا تو پھر ماننا پڑے گا کہ وہ کسی کے پیدا کرنے سے پیدا ہوا تو اسی پیدا کرنے والے کو تمام عالم کا بھی خدا ماننا پڑے گا، کیوں کہ اس کی عالی ذات کے بغیر جو کچھ بھی ہو گا، عالم کہلائے گا، حالانکہ کل عالَم کا پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے جیسا کہ ثابت ہو چکا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ عالَم کا بھی خالق وہی ہو گا جس نے اللہ کو پیدا کیا پس اس سے یہ لازم آئے گا کہ بعض عالَم نے عالَم کو پیدا کیا حالانکہ یہ ناممکن ہے۔

اسی طرح ایک صفت اللہ کی (حی) ہے یعنی اللہ تعالیٰ زندہ ہے۔ جیسے کہ قرآن میں آیا ہے ھو الحی القیوم یعنی وہ زندہ اور ہر چیز کا قائم رکھنے والا ہے۔ (قدیر) ہے یعنی اس کو صفت قدرت حاصل ہے۔ وہ اس طرح کہ ایک موجود چیز کو نابود کر سکتا ہے، اور نابود کو موجود کر سکتا ہے، آسمان کو زمین اور زمین کو آسمان بنا سکتا ہے، کافر کو ولی اور ولی کو کافر، بادشاہ کو فقیر اور فقیر کو بادشاہ بنا سکتا ہے۔ جیسے کہ اللہ قرآن میں فرماتا ہے کہ ان اللہ علیٰ کل شیٔ قدیر۔ یعنی اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ مسلمانوں کے بغیر اکثر اللہ تعالیٰ کو عاجز سمجھتے ہیں۔ مثلاً یونان کے فلسفی خدا کو اُسکی مخلوقات میں تصرف

کرنے سے عاجز سمجھتے ہیں اور اُنکا خیال ہے کہ وہ آسمانوں کو فنا نہیں کرسکتا ہے۔نصاریٰ یعنی انگریزوں کا عقیدہ ہے کہ عیسیٰؑ کو یہودیوں نے پھانسی دی اور نہایت ذلت سے مارا جبکہ عیسیٰؑ خدا سے بہت آہ وزاری کے ساتھ فریاد کرتے تھے کہ مجھے بچالے اور ان کے ہاتھ سے چھڑادے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ عیسیٰؑ ، روح القدس اور خدا تینوں مل کر ایک ہیں۔اگر اس بات کو مانا جائے کہ حضرت عیسیٰؑ خدا یا خدا کا جز ہے تو ان کے عقیدے سے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا اپنے آپ کو نہ بچاسکا اور خدا یہود کے ہاتھ سے قتل ہوا۔اسی طرح یہودی لوگوں کا ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام رات حضرت یعقوبؑ سے کشتی لڑتا رہا اور اندر جانے سے یعقوبؑ مانع آتے تھے۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ اوتار میں اللہ تعالیٰ حلول کرتا ہے یعنی خدا کسی جنم میں داخل ہوکر مخلوق کی اصلاح کے لیے دنیا میں آتا ہے اور وہ اوتار خود خدا ہوتا ہے، حالانکہ جس رام چندر جی کو وہ اوتار مانتے ہیں ان ہی کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اس کی بیوی (سیتا) کو لنکا کا راجہ راون چھین کرلے گیا تو پھر کافی مدت تک رام چندر جی اُکے عشق میں پریشان حال رہا، لیکن اس کو معلوم نہ ہوسکا کہ سیتا جی کہاں ہے۔آخر جب ایک بار پتہ چلا تو راون کو شکست دینی چاہی لیکن ہنومان کی مدد کے بغیر شکست نہ دے سکا۔اس سے تو عام فہم انداز میں یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا ایک عورت کے عشق میں مبتلا رہا، اس کو اس عورت کا حال معلوم نہ ہوسکا اور جب معلوم ہوا تو راون کو بغیر امداد کے مار نہ سکا۔ہندو لوگ ہنومان کو ایک دیوتا سمجھتے ہیں، جس نے سیتا جی کی بازیابی میں رام چندر جی کی مدد کی تھی۔اور دیوتا ہندوؤں کے نزدیک فرشتہ جیسی کوئی شے ہوتی ہے حالانکہ اسلامی عقیدہ کے مطابق اللہ کوئی بھی کام کرنے کے لیے کسی بڑے سے بڑے فرشتہ کا محتاج نہیں ہوتا ہے بلکہ کچھ بھی کرنے میں تمام فرشتے اللہ کے محتاج ہوتے ہیں۔اہل اسلام کے نزدیک اللہ کو صفت ارادی حاصل ہے یعنی جو چیز بھی بنتی ہے اُسی کے ارادے سے بنتی ہے۔ابتدا میں جو ارادہ کیا تھا اب تک اُسی کے مطابق سب کچھ ہو رہا ہے۔ازل لغت میں اس زمانے کو کہتے ہیں، جس کی کوئی ابتداء نہ ہو۔یہی مطلب ہے اللہ کے اس فرمان کا کہ فعّالٌ لما یرید (یعنی جس چیز کا وہ ارادہ کرتا ہے اس کو اسی وقت کرلیتا ہے یہ نہیں کہ وہ کسی چیز کا ارادہ کرے پھر وہ چیز نہ ہوجائے۔پس گمراہ فلسفیوں کا یہ عقیدہ کہ خدا کے ذریعے سے یہ عالم بغیر ارادہ کے اور بغیر اختیار کے خود بہ خود سرزد ہوا

بالکل غلط اور خلاف تحقیق ہے۔ اسی طرح کچھ اہل کتاب اور ہندوؤں کا یہ عقیدہ کہ اللہ بعض چیزوں کے پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے لیکن اُس سے نہیں ہوسکتی ہیں ان کی کم فہمی پر دلالت کرتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہر چیز اللہ کے ارادے اور اختیار سے ہوتی ہے۔

(جاری)

تبصرے اور تجزیے

''نظریہ اجتہاد اور اقبال'' نام کی کتاب پر تبصرہ

[از سرپرست ماہنامہ رسالہ ھٰذا]

ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی صاحب نے ایک کتاب ''نظریہ اجتہاد اور اقبال'' عنوان کے تحت تحریر فرمائی ہے۔اور اس کتاب کو ذکری انٹرنیشنل پبلشرز دھلی والوں نے مارچ ۲۰۱۳ھ میں شائع کیا۔اگر چہ یہ کتاب جون ۲۰۰۳ء میں بھی پہلی بار شائع ہوئی تھی۔یہ موضوع دراصل گنائی صاحب نے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے پیش کیا تھا جس کی جانچ پرکھ کرنے کے لیے پروفیسر رئیس صاحب کی خدمت میں بھیجا گیا تھا جنہوں نے اس کی سراہنا کر کے اس کو کتابی صورت میں شائع کرنے کی تاکید کی۔اس کتاب کے متعلق قابل قدر اہل قلم حضرات نے کتاب کی ابتداء میں اپنے تاثرات قلمبند کیے ہیں جن میں پیش گفتار عنوان کے تحت پروفیسر بشیر احمد نحوی صاحب نے بھی اپنا اظہار خیال فرمایا ہے چونکہ مصنف نے کتاب کے صفحہ نمبر ۳۴۸ پر اس خواہش کا ظہار کیا ہے کہ مصنف کو قارئین کے تاثرات اور مشاہدات کا انتظار رہے گا ان کی اس خواہش کے پیش نظر میرے فرزند اور دینی امور میں مدد ومعاون عزیزی بلال احمد نے احقر کو بھی اپنے تاثرات درج کرنے اور ''راہِ نجات'' میں شائع کرنے کی ترغیب دی۔جو ایک علمی اور تحقیقی رسالہ ہونے کے ناطے ہمارا فرض بھی بن جاتا ہے۔

''تقلید اور اجتہاد'' کے متعلق اس وقت تک اہل علم اور اہل قلم حضرات نے بہت کچھ لکھا ہے ۔مسلمانوں کے علم کا بنیادی ماخذ قران اور حدیث ہے ۔دونوں باتوں کے متعلق ان دونوں ماخذوں میں محتاط انداز میں گنجائش ہے اور یہ بھی ان دونوں ماخذوں کے حق وصداقت ہونے کی ایک کھلی دلیل ہے، جس میں ہر زمانے کے حالات وواقعات سے نمٹنے کی بھرپور صلاحیت ہے۔اسلام نہ اندھی تقلید کا قائل ہے اور نہ بے لگام اجتہاد کو تسلیم کرتا ہے ۔اس معاملے میں جو سب سے بڑی بے انصافی ہوئی وہ یہ ہے کہ کچھ تنگ نظر لوگوں نے دین اسلام کو اتنا تنگ بنانے کی خطا کی کہ ایک طبقہ اسلام کو اپنانا اپنے لیے ناممکن تصور کرنے لگا اور دوسرا طبقہ اتنا آزاد بنا، جنہوں نے اپنی کم نظری کی وجہ سے اسلام کو ایک معجون مرکب بنانا چاہا اور اس میں اتنی ملاوٹ کی کہ اسلام کی اپنی اصل چاشنی اور حرارت بھی ان کی زندگیوں میں قائم نہ رہ سکی ۔نتیجہ یہ نکلا کہ ایک طبقے کو قدامت پرستی کا خطاب ملا اور دوسرے طبقے کو جدت پسندی کا خطاب ۔اس طرح اتنی دوریاں بڑھ گئیں جن کو اگر بعد المشرقین (Redical difference) کا نام دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔حالانکہ اسلام ہمیں اعتدال پسند بننے کی تعلیم دیتا ہے ۔اس افراط وتفریط سے بچنے کے لیے امت اسلامیہ کی چند مخلص، ہمدرد اور علمی شخصیات نے اپنے اپنے دور میں کوشش کی کہ اسلام کے بنیادی عقائد اور اسکی اصل روح اور اسپرٹ کو برقرار رکھتے ہوئے وقتی حالات اور ضرورتوں کے پیش نظر ایسی دلنشین تشریح کی جائے جس میں اسلاف کی تحقیقات ،تجربات اور تعلیمات سے استفادہ کرتے ہوئے قوم کو ایک نقطے پر مجتمع کرنے کی قوت ہو۔لیکن آج کے دور میں یہ کام ایک فرد واحد انجام نہیں دے سکتا ہے ۔بلکہ اس کے لیے ایک منظم ادارے کی ضرورت ہے جس میں ایک طرف علمائے حقانی بھی موجود ہوں اور دوسری طرف سے دین پسند اور جدید سائنسی علوم کے واقف کار لوگ بھی علماء کی نگرانی میں شریک ہوں اور دونوں کے تعاون سے یہ کام آگے بڑھایا جائے ۔اس ضرورت کی طرف امت کے جن چیدہ چیدہ حضرات نے ہمیں متوجہ کیا ہے ان میں علامہ اقبالؒ کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے کیونکہ وہ دونوں علوم سے کماحقہ واقف تھے اور ان کا دعویٰ ہے کہ

بہ دور فتنۂ عصر کہن او

بہ دور فتنۂ عصر رواں من

(ترجمہ) جس طرح مولانا رومی نے اپنے زمانے کے فتنوں کو سمجھ کر ان کی سرکوبی کی اسی طرح موجودہ دور کے فتنوں کا ادراک اللہ نے مجھے عطا کیا ہے۔

ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی صاحب نے بڑی محنت سے علامہ اقبالؒ کے خیالات کی تسہیل اور ان کو اس میدان کے داعی کی حیثیت سے فرد واحد ہونے کے الزام سے بچانے کے لیے دیگر نامور علماء اور دینی شخصیات کے ان جیسے نظریات میں ان کا ہمدم و ہمساز ثابت کرنے کی ایک جاندار کوشش کی ہے اب ضرورت اس بات کی ہے کہ حضرات علماء اور دین پسند دانشور سامنے آئیں اور مل جل کر اس کام کو انجام دینے کی کوشش کریں تا کہ امت افتراق اور انتشار سے بچتے ہوئے دین حق پر عمل پیرا ہو جائیں۔ اس موضوع کے سمجھنے کے لیے ڈاکٹر صاحب کی کتاب ایک قابل قدر کوشش ہے۔ اللہ انہیں اس کوشش کا جزائے خیر دے آمین۔

☆

مکتوبات بنام راہِ نجات

ازقلم: منظور احمد ڈار دیوبندی
بمیار، بونیار بارہمولہ

ماہ نامہ راہِ نجات
''ایک تحقیقی، دینی دعوتی، علمی، ادبی اور اصلاحی رسالہ''

ماہ نامہ راہِ نجات ایک ایسا خزانہ علم وعرفان ہے، جہاں سے ایک فرد اپنی وسعت کے مطابق اپنے دامن کو ایمان وصداقت، علم وفکر، عزم وحوصلہ اور جذبۂ شوق وتحقیق سے بھر دیتا ہے۔ یہ ایک ایسا گلستان ہے جہاں ہر رنگ اور ہر خوشبو کے پھول نہ صرف انسانی ذہن کو معطر کرتے ہیں بلکہ آنکھوں کو بھی ٹھنڈک بہم پہنچاتے ہیں بشرطیکہ انسان قوتِ بصارت سے محروم نہ ہو۔

راہِ نجات کا یہ فیضان سال ۲۰۱۲ء سے جاری ہے اور لاتعداد لوگ اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔ راہِ نجات کے ان احسانات کو بہت سے کشمیر کے چوٹی کے علمائے حق اور دانشوروں نے سپردِ قلم کیا ہے تاکہ لوگوں کے سامنے اس رسالے کی اہمیت اور افادیت واضح ہو جائے۔

ماہ نامہ راہِ نجات کے آج تک چھپنے والے سارے شمارے لائق ستائش ہیں۔ ان تمام رسالوں میں علم کے سمندر کو کوزے میں بند کیا گیا ہے۔ یوں تو ہماری اس ریاست میں بہت سے دینی رسالے شائع ہو رہے ہیں مگر جو تاثیر احقر نے راہِ نجات میں پائی وہ دیگر رسالوں میں نہیں ملی، جس کی واحد وجہ یہ ہے کہ راہِ نجات ایک تحقیقی رسالہ (based on research) ہے۔ اس میں چھپنے والا ہر مضمون بے حد معلوماتی اور ٹھوس ہوتا ہے۔ یہ رسالہ یوں تو ہر فرد کے لیے بے حد مفید ہے مگر خصوصاً نوجوانوں کے لیے زیادہ ہی اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ یہاں کے نوجوان اپنی دینی اور ملی میراث سے ناواقف ہیں۔ دینی ذوق رکھنے والے نوجوانوں کو برصغیر کے بڑے بڑے علماء کے بارے میں تو تھوڑی بہت معلومات حاصل ہیں مگر اپنی ریاست کے گزرے ہوئے چوٹی کے علماء سے وہ ناواقف ہیں۔ ہم مفسر قرآن، مجدد ملت، حکیم الامت علامہ شاہ اشرف علی صاحب تھانویؒ کے

بارے میں تو تھوڑی بہت معلومات رکھتے ہیں مگر اپنی اس ریاست کے شارح سنت، قاطع بدعت، داعی توحید مولانا سید عبدالولی شاہ صاحبؒ کی ذات عالی سے بے خبر تھے۔ ادارہ راہِ نجات نے اپنے ایک خصوصی شمارے میں کشمیر کے پانچ بڑے علماء پر کافی تحقیق، محنت ومشقت کر کے مضامین شائع کئے، جن سے اُمت کے ہر فرد اور خصوصاً نوجوانوں کو بے حد فائدہ ہوا۔ امید کرتے ہیں کہ ادارہ راہِ نجات اپنی یہ تحقیقی سرگرمی جاری رکھے گا تا کہ کشمیر کے مسلمان اپنے ان گمنام مخلص علماءِ دین کی دینی خدمات کے بارے میں جان سکیں۔

دعوت وتبلیغ کی تحریک کشمیر میں کیسے پہنچی اور کب پہنچی، احقر کو اس بارے میں جاننے کا بہت شوق تھا مگر احقر کو کسی کتب خانہ سے اس موضوع پر مواد نہ مل سکا مگر یہ کمی بھی ''راہ نجات'' کے ایک شمارے سے دور ہوئی جس میں تحریک دعوت وتبلیغ اور کشمیر پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔ ایک عام قاری خود بھی اس بات کا بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس جریدے کے پورے عملے کو ایسا تحقیقی رسالہ شائع کرنے میں کتنی محنت ومشقت اُٹھانی پڑتی ہوگی۔

آج کے اس پُرفتن دور میں ایسا رسالہ منظرِ عام پر لانا وقت کی ضرورت ہے۔ ہر جریدے کے مواد میں کافی وسعت پائی جاتی ہے اور زبان کی سادگی سے تو اس رسالے میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ ہر گذرنے والے دن کے ساتھ مصنفین کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے، جس سے ایک عام قاری کو مختلف موضوعات میں واقفیت بہم پہنچ رہی ہے۔

ہر کامیابی کے پیچھے ایک کامیاب ہاتھ ہوتا ہے۔ جریدہ راہِ نجات جو ترقی کے منازل تیزی سے طے کر رہا ہے اسکے پیچھے بھی اس جریدے کے سرپرست جناب الحاج غلام نبی وانی صاحب کا ہاتھ ہے۔ سرپرست راہِ نجات ایک ''حرکت'' کا نام ہے جو ہر لحہ محو جدوجہد ہر آن کام میں مصروف، ہر طرف گونجتی آواز، ہر سمت پھیلتی روشنی اور چمنستانی وادی کی فضاؤں کو معطر کرتی خوشبو ہے۔

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دُعا ہے کہ یہ رسالہ ہر گذرنے والے دن کے ساتھ ترقی کرتا رہے اور لوگوں کی علم کی پیاس یوں ہی بجھاتا رہے

پھلا پھولا رہے یا رب چمن ہماری اُمیدوں کا
جگر کا خون دے دے کر یہ بُوٹے ہم نے پالے ہیں

☆☆☆

اب سے آسؔی

ذاتی تخلص میں تبدیل اور اس کی وجہ

احقر عنفوان شباب سے ہی اپنا تخلص عاصؔی اختیار کرتا آیا اور اس میں کوئی تصنع نہیں ہے کہ میں ایک بندۂ گنہگار ہوں اور ہر وقت اپنے گناہوں پر نظر ہے۔ صحافتی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد اور رسالہ راہِ نجات کے اجراء کے بعد بھی احقر نے اپنے نام کے ساتھ تخلص کے طور پر عاصؔی ہی استعمال کیا ۔لیکن ادبی دنیا میں دوست احباب کسی بھی ادیب یا شاعر کے لیے اس کا تخلص ہی بار بار زبان پر لاتے ہیں اور میرے کئی کرم فرما بزرگوں اور علم دوست حضرات کو اس لفظ کا استعمال شاق گزرتا تھا اور انہوں نے مجھے اس کے بدلنے کا مشورہ دیا۔ چونکہ میں نے اپنے منظوم کلام میں اس لفظ کو بطور تخلص استعمال کیا ہے لہٰذا اس تخلص کا غیر مماثل لفظ مقطع میں وزن کے لحاظ سے غیر موزوں رہتا۔ اپنے کرم فرما بزرگوں اور مشفق دوستوں کے اصرار کے پیش نظر احقر نے اپنے لیے عاصؔی کے بجائے آسؔی کا تخلص پسند کیا۔ اور مصلحت اس میں یہ ہے کہ ہر گنہگار کو اللہ کے رحم و کرم کا امیدوار رہنا چاہیے۔ اگرچہ مصباح اللغات میں ''الآسی'' کا معنی طبیب و معالج بھی لکھا ہے لیکن ''صحتِ الفاظ'' نامی کتاب میں امیدوار لکھا ہے اور ''لغات کشوری'' میں غمخوار بھی لکھا ہے اردو زبان بھی اس لفظ کی رعایت سے آس امید کے لیے استعمال کرتی آئی ہے۔ آئندہ کے لیے ان ہی معنی میں آسؔی کا لفظ لیا جائے اور عاصؔی کا متبادل تخلص آسؔی سمجھا جائے۔

از سرپرست راہِ نجات

RNI NO: JKURD/2011/45419
Postal Reg. No JK/137/2011-20114

Monthly

RAH-I-NAJAAT

BARAMULLA

راہِ نجات

بے خبر بن کے نہ رہ پہچان لے اللہ کی ذات — ڈھونڈ لینا کام ہے تیرا یہاں راہ نجات
خواب غفلت میں مگر جس نے گزاری زندگی — مر کے ملتی ہے کہاں اس کو وہاں راہ نجات
چشم بینا ہو عطا جس صاحب ذی ہوش کو — پا ہی لیتا ہے وہ منزل ہے جہاں راہ نجات
تھام لے دامن محمد ﷺ اور اس کی آل کا — چھوڑ کر ان اہل حق کو ہے کہاں راہ نجات
وہ ہدایت کے ستارے یعنی اصحاب کرامؓ — پورے عالم میں صدا دی ہے قراں راہ نجات
بو حنیفہؒ جاگنے والا وہ راتوں کو سدا — ہے کیا آسان تر جس نے بیاں راہ نجات
شافعی و مالکی و حنبلی سب اہل حق — حق کی خاطر تھا زباں پر ہر زماں راہ نجات
اولیاء و اصفیاء و اتقیاء و اذکیاء — مرتے دم تک تھا برابر بر زباں راہ نجات
عمر بھر عاصیؔ سدا اس فکر میں ڈوبا رہا — فکر کی پنہائیوں میں ہے نہاں راہ نجات

(عاصیؔ فتح گڈھی)

Printed and Published by :*Muneer Ahmad Wani**Printed at :*Universal Printing Press Baramulla*:Published From:*Baramulla Kashmir*.
Editor :*Muneer Ahmad Wani* *E mail : Salik_bilal@yahoo.com